چراغِ راہ
خواجہ عبدالحکیم انصاری

مرتبہ: محمد قاسم توحیدی

AL - MASHRAQ PUBLISHERS LAHORE.

تھری سٹارز پرنٹنگ پریس

۳۰ آبکاری روڈ (انارکلی) لاہور ۲

اشاعت اول	مارچ ۱۹۷۱
تعداد	دو ہزار
ناشر	محمد قاسم توحیدی
مطبع	تھری سٹار پریس لاہور

قیمت

سفید کاغذ	۵-۰۰
نیوز پرنٹ	۳-۰۰

فہرست
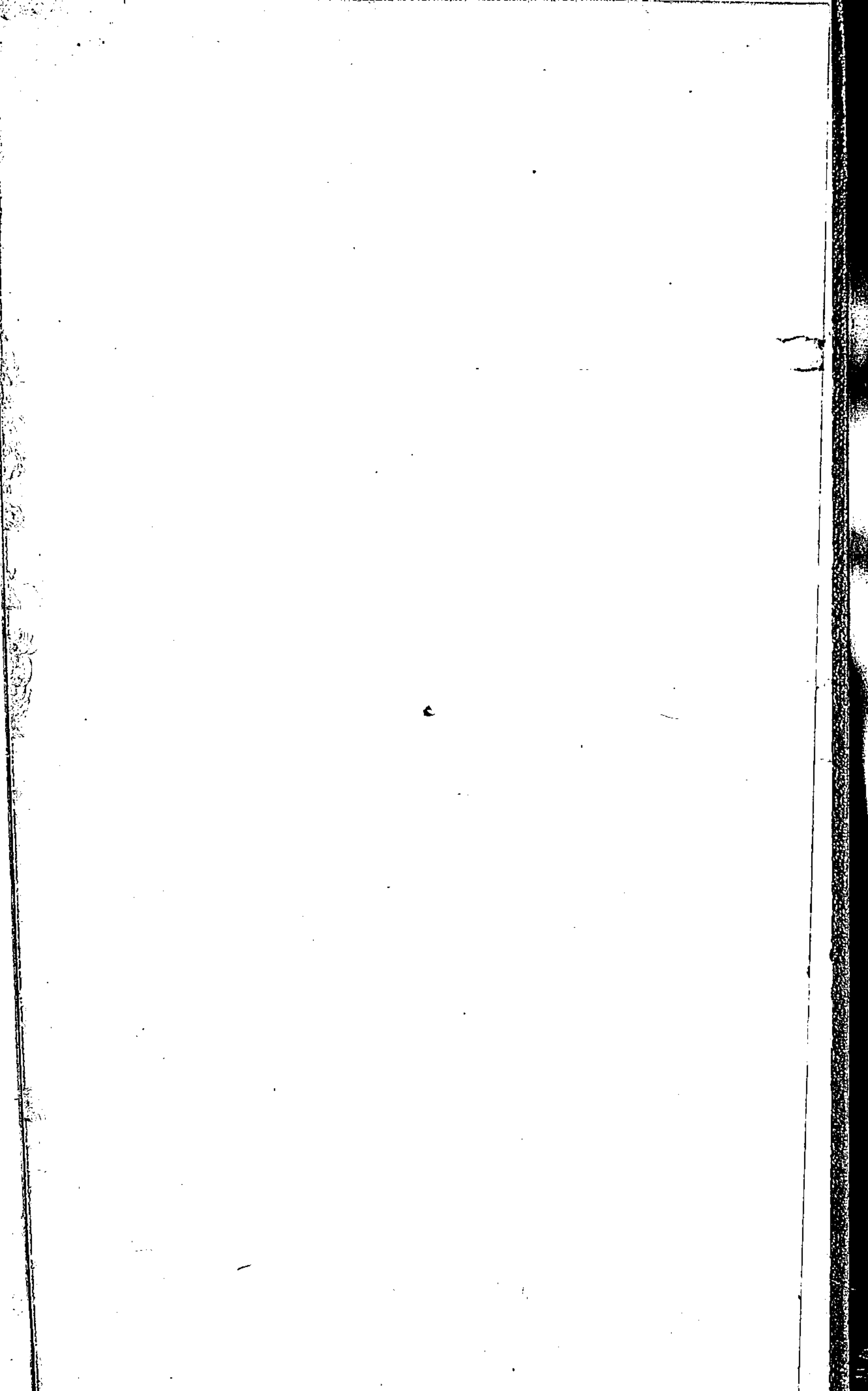
پیش لفظ

انسان اپنی آفرینش سے ہی خالقِ حقیقی کی تلاش میں ہے ۔ یہ جستجو اس کی فِطرت کا خاصہ ہے ۔ ازل سے لاکھوں فلسفی، سائنس دان، حکیم، راہب اسی ابدی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں ۔ اسی جستجو نے مختلف مذاہب کا رُوپ دھارا اور خدا تک پہنچنے کے راستے متعیّن کیے ۔ لیکن انسانیت کی ترقی کے ابتدائی مراحل میں تقریباً سب مذاہب اور مسالک میں خُدا رسی کے لیے ترکِ دُنیا اور ترکِ لذائذ کو لازمی قرار دیا گیا ۔ چنانچہ معدودے چند لوگوں کو بلا کی جفاکشی اور طویل صعوبتوں کے بعد خدا کا عرفان حاصل ہوتا رہا اور وُہ بھی جزوی طور پر ۔

جب انسانیت سنِ بلوغ کو پہنچی اور خاتم الانبیاء سرورِ کائنات جناب رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم تشریف لائے تو اُنھوں نے دُنیا و دین کو ایک دُوسرے میں یُوں سمویا کہ ایک کے بغیر دُوسرے کی تحصیل نہ صرف غیر مستحسن قرار پائی بلکہ مشکل بھی ہو گئی ۔ حضورؐ نے زندگی کے ایسے اصول وضع کیے اور خُدا شناسی کے ایسے طریقے بتائے جو وقتی ہیں نہ مقامی، وُہ زمان و مکان کی قیود سے ماورا ہیں ۔ ان میں ایک طرف معاشرے کو غیر صحت مند رُجحانات اور تخریب پسند قوتوں سے پاک کرنے اور اس میں صحت، توانائی، توازن اور پاکیزگی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے تو دُوسری طرف خدا تک رسائی میں آسانی بھی ۔ لیکن امتدادِ زمانہ سے حضورؐ کی یہ زندگی بخش تعلیم ماند پڑتی گئی اور مسلمان صراطِ مستقیم سے ہٹ کر ایسے مشاغل میں اُلجھ گئے جس سے وُہ توحید سے بھی دُور ہو گئے اور دُنیاوی جاہ و

حشمت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ حالات کی مقتضیات کے مطابق وقتاً فوقتاً اولیاء اللہ، اصفیا اور علمائے دین نے توحید کی شمع روشن کی اور لوگوں کو عظمت و عزت اور خدارسی کا راستہ دکھایا، لیکن بعد میں ان مقتدر ہستیوں کی تعلیم بھی عجمی تصورات اور غیر اسلامی اعتقادات کی نذر ہو گئی۔ توحید جو زندگی کا ایک بنیادی، زندہ اور حرکاتی اصول ہے مدرسوں میں فقط مسئلہ علم کلام ہو کر رہ گیا اور خانقاہوں میں ویدانت اور سوفسطائی نظریات سے ملوث۔

رُوحانیت کے متعدد سلسلے جن کا مقصد وحید ہی توحید کی شمع روشن رکھنا اور خدا تک پہنچنے کے راستہ کو ہر آلائش سے پاک و صاف کرنا تھا خود شرک کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ اب تقریباً سب سلسلوں میں توحید پر زور ہے نہ سیرت و کردار کی تعمیر پر۔ تقریباً سبھی میں اپنے پیروں کی پرستش کی جاتی ہے۔ انھیں سے مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ انھیں کا تصور قائم کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ موت اور حیات، بیماری اور صحت، افلاس اور رزق، ذلت اور عزت، ناکامی اور کامیابی سب انھیں کے اختیار میں سمجھی جاتی ہے۔ تعمیر کردار، اخلاق کی درستگی، فکر و نظر کی پاکیزگی، باہمی معاملات کی صحت کی طرف نہ توجہ دی جاتی ہے نہ انھیں سلوک کے مراحل طے کرنے میں کوئی خاص وقعت حاصل ہے۔ زیادہ زور وظائف اور اَوراد پر ہوتا ہے یا پھر پیر کی خدمت اور اُس کا تصور باندھنے پر۔ وہ تعلیم اور اخلاقِ حسنہ جو ان عالی سلسلوں کے جلیل القدر ربانیوں کا طرۂ امتیاز تھا اب تقریباً ناپید ہے۔ کچھ اولیاء اللہ اب بھی صحیح اسلامی روایات پر قائم ہیں لیکن وہ دنیا کی نگاہ سے اوجھل ہیں۔ وہ اپنی ہی روحانی رفعت و ترقی میں مگن ہیں۔ ملت پر جو کچھ آج کل بیت رہی ہے اس سے وہ قطعی بے نیاز ہیں لیکن بقول علامہ اقبالؒ ؎

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مسلمان ساری دُنیا میں عالمِ سکرات میں ہیں۔ کہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے۔ کسی عالمِ دین اور کسی معروف رُوحانی پیشوا کو یہ توفیق نصیب نہیں ہُوئی کہ وُہ قوم کے درد کا مداوا کرے، اِس میں نئی زندگی کی رُوح پھُونکے، اس کا دِل پھر سے توحید کی لَو سے روشن کرے، اُسے خالقِ حقیقی تک پہنچنے کا راستہ بتلائے یا اُسے دُنیا میں رہنے کا قرینہ ہی سکھائے۔

"ملت کو آج ایسے بزرگوں کی ہرگز ضرورت نہیں جو تعویذ گنڈوں اور دم رُود سے کچھ مریضوں کو تندرست کر دیں، یا چند غریب ان کی دُعا سے امیر کبیر بن جائیں یا کچھ مقدمے جیت جائیں، یا چند بے اولادوں کے اَولاد پیدا ہو جائے، یا کچھ کفار و مشرکین مسلمان ہو کر ملّت کی تعداد میں بے کار لوگوں کا اضافہ کریں۔ آج کل تو ضرورت ایسے اولیاء کی ہے جو فاسق و فاجر مسلمان کو سچّا مسلمان اور سچّے مسلمانوں کو پکا مومن اور موحد بنا سکیں، جو اپنی تعلیم و توجّہ سے مسلمانوں میں ایسی فراستِ و بصیرت پیدا کر سکیں کہ وہ تمام تفرقے اَور اختلافات مٹا کر ایک جان اور ایک قالب کی طرح مربوط و متحد ہو جائیں، حق و باطل میں تمیز پیدا کر سکیں، سُستی اَور کاہلی چھوڑ کر کام کرنا اور کام کرتے رہنا سیکھیں، اللہ اور رسولؐ کی سچّی محبت کا جنون اُن کے لیے سرمایۂ دانش ہو۔ وُہ بقائے ملّت کے لیے جان و مال قربان کرنا اپنی زندگی کا مقصد جانیں اور ہر طرف سے اپنا مُنہ موڑ کر صرف اللہ کی طرف کر لیں۔"

محولہ بالا ارشاد زیرِ نظر خطبات کے مصنّف خواجہ عبدالحکیم انصاری دام برکاتہم کا ہے جنھوں نے توفیقِ ایزدی سے تصوّف کو ہر عجمی آلائش اور آلودگی

سے پاک وصاف کرکے اُسے شرعِ محمدیؐ کے مطابق ڈھالنے کے لیے ایک نئے سلسلۂ تصوّف "توحیدیہ" کی بنا کی ہے۔ یہ سلسلۂ توحیدیہ "کیا ہے؟" فقط اللہ تعالیٰ کا ہو کے رہنا۔" اس کا مقصد خالص دین کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے یہ نہ تو دُنیا سے فرار سکھلاتا ہے نہ اس سے محبت، اس میں دین و دُنیا دونوں کی درستگی کا اہتمام ہے۔ اس میں نہ صرف رُوحانی صحت، پاکیزگی اور توانائی پر زور ہے بلکہ جسمانی اور ذہنی صحت، پاکیزگی اور توانائی پر بھی۔ اس میں دین کی تحصیل و تکمیل دُنیا کی تحصیل و تکمیل سے الگ نہیں۔ یہ دُنیا میں رہتے ہُوئے اسلامی عبادات پر صحیح عمل سے خدا کا عرفان عطا کرتا ہے۔ یہ سلسلہ اپنے ماحول اور گرد و پیش کو پاک و منزّہ اور صحت مند رکھنے کا طریقہ سکھاتا ہے۔ شخصیت کی تعمیر، باہمی معاملات کی درستگی اور معاشرے کی ترقی اس کے حلقۂ عمل میں اولیت رکھتے ہیں اور ایسی ہی طریقت کی آج دُنیائے اسلام کو ضرورت ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

پس طریقت چیست اے والا صفات ۔۔۔ شرع را دیدن بہ اعماقِ حیات

سلسلۂ توحیدیہ میں نہ پیر کو خدا کا درجہ دیا جاتا ہے نہ اُسے اچھائی یا برائی کا مختار ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس میں نہ ریاضتیں ہیں، نہ چلّہ کشی، نہ لذائذ دُنیا سے نفرت، اکلِ حلال اور سیرت و کردار کی تعمیر پر البتّہ بہت زور ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ سے محبّت پیدا کرنے کے لیے چند واجبات پر عمل بھی۔ اس مقصد کے لیے روزانہ چند منٹ وقف کرنے پڑتے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ پرانے وقتوں میں سلوک کی جن منازل کو طے کرنے میں سالہا سال کی مشقت اور ریاضت کرنی پڑتی تھی وُہی منازل اس سلسلہ میں تھوڑی سی یکسوئی اور محنت سے چند مہینوں میں طے ہو جاتی ہیں۔

جناب خواجہ عبدالحکیم انصاری صاحب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے سے

پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان سیئات یعنی بُرے اعمال سے نفرت کرنے لگتا ہے اور حسنات یعنی نیک اعمال کی طرف از خود راغب ہو جاتا ہے۔ جُوں جُوں نیکی کا جذبہ بڑھتا جاتا ہے رُوحانی یُسر پیدا ہوتا جاتا ہے۔ دل میں کشاد اور طبیعت میں لطافت پیدا ہوتی جاتی ہے، نماز میں مزا آنے لگتا ہے، غُصّہ، نفرت اور سیئات پر مکمل قابُو ہو جاتا ہے اور دل میں اللہ کی محبّت کی جوت جلنے لگتی ہے۔ آہستہ آہستہ وُہ ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے۔ اُس کی زندگی، قربانی اور موت صرف اُسی کی خاطر ہو کر رہ جاتی ہے۔

"چراغِ راہ" حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاری صاحب کے ان خطبات کا مجمُوعہ ہے جو وُہ سلسلۂ عالیہ توحیدیہ کے سالانہ اجتماعات میں ارشاد فرماتے رہے ہیں۔ مختلف مقامات پر دیے گئے ان خُطبات میں تسلسل کا خاص التزام رکھا گیا ہے جو سالکان راہ طریقت کے لیے بیش بہا خزانہ بھی ہے اور ملت کے لیے درسِ حیات بھی۔ اس کے سرسری مطالعہ سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ تصوّف و معرفت کے بارے میں حضرت قبلہ انصاری صاحب کے افکار کیا ہیں اور وُہ کس قسم کے معاشرے کو وجُود میں لانے کی سعی کر رہے ہیں۔ ان کی تعلیمات کا نچوڑ تو ان کی معرکہ آرا تصنیف "تعمیرِ ملّت" میں ملتا ہے لیکن زیرِ نظر مجمُوعہ خُطبات میں حضرتِ ممدوح نے راہِ سلوک میں پیش آنے والے نشیب و فراز کو جس حکیمانہ انداز میں پیش فرمایا ہے۔ اس کی مثال کم ملتی ہے۔ جہاں ایک سالک قرب و عرفانِ خداوندی حاصل کرنے کے لیے اپنی استعداد کے مطابق استفادہ کر کے اپنا گوہرِ مقصود پا سکتا ہے وہاں ایک عام قاری بھی اپنی دُنیا و دین سنوارنے کے لیے یقیناً اتنی بصیرت حاصل کر سکتا ہے جو ایک سچّے مسلمان کے لیے نجات کا باعث ہو۔ خُطبات کا اُسلوب سادہ اور عبارت بہت سلیس ہے

مصنف کے ہر لفظ سے سوزِ دروں، امعانِ نظر، وسعتِ فکر اور پختگی جھلکتی ہے
ان کے لہجہ میں خلوص و محبت کی خوشبو ہے بقول حافظؒ ؎

زانفاس خوشش بوئے کسے می آید

قاری اس سوز اور درد کو خود محسوس کرے گا جس سوز اور درد نے جناب
انصاری صاحب قبلہ کو "سلسلہ توحیدیہ" قائم کرنے پر مجبور کیا ہے
اور نیا سلسلہ قائم کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ "تا نہ بخشند خدائے بخشندہ"
خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ "سلسلۂ عالیہ توحیدیہ"
کو تکوینِ دین اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا باعث بنائے۔ آمین

خادم الفقراء
محمد قاسم توحیدی

لاھور
یکم فروری ۱۹۷۱ء

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہٖ الکریم

برادرانِ سلسلہ توحیدیہ ——— السّلام علیکم

اللہ کا بڑا کرم اور احسان ہے کہ آج ہم اپنے حلقہ کے چوتھے سالانہ اجتماع میں ایک مرتبہ پھر اکٹھے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے میں تمام شرکت کرنے والوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو دُور دراز مقامات سے تکلیف اٹھا کر محض اللہ کے واسطے یہاں تشریف لائے ہیں اور اس کے بعد خُدا سے دُعا کرتا ہوں کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو دین اور دُنیا دونوں کی نعمتیں عطا فرمائے اور جو لوگ شرکت نہیں کر سکے اُن کو بھی اپنے فضل و کرم اور نوازش سے محروم نہ رکھے۔ **آمین!**

تمام جماعتیں جو کوئی بڑا کام کرنا چاہتی ہیں ایسے سالانہ اجتماعات ضرور منعقد کیا کرتی ہیں۔ لیکن فائدہ صرف اُنہی جماعتوں کو پہنچتا ہے جن کے ارکان ایسے اجتماعات میں منظور ہونے والی تجاویز پر جوش، استقلال اور خلوص سے عمل کرتے ہیں۔ میں بھی آپ لوگوں سے یہی اُمید رکھتا ہوں کہ آپ لوگ اس

اجتماع میں تماشہ دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ دینی اور دُنیوی فوائد حاصل کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ دینی اور دُنیوی فوائد حاصل کرنے اور اعلیٰ درجے کا مومن اور بزرگ بننے کے لیے جتنی باتیں ضروری ہیں وُہ میں پہلے ہی تعمیرِ ملت اور طریقتِ توحیدیہ میں واضح طور پر لکھ چکا ہوں اور اس کے علاوہ سینکڑوں مرتبہ تقریروں اور نجی تحریروں میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ آج میں جو کچھ بیان کروں گا۔ اس میں بھی زیادہ تر وہی باتیں ہوں گی۔

اس تکرار سے آپ کو اُکتانا اور بددل نہیں ہونا چاہیے اور یہ اصُول یاد رکھنا چاہیے کہ جن باتوں کو خاص طور سے توجّہ دلانا مقصود ہوتا ہے اُن کو جتنی مرتبہ بھی بیان کیا جائے کم ہے۔ خود قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے اور جتنے اوامرو نواہی اور دُوسری ضروری باتیں ہیں اُن کو سینکڑوں مرتبہ دُہرایا ہے۔ مثلاً نماز پڑھنے کا حکم تقریباً سات سو مرتبہ دیا گیا ہے اور اتنی ہی مرتبہ قدرت کی نشانیوں پر غور و فکر کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آج میں کچھ نئی باتیں بھی بیان کروں گا جو شاید آپ کی دلچسپی کا مُوجب ہوں۔ یہ میری اپنی زندگی اور سلوک و تصوّف میں اپنے ذاتی تجربوں کا کچھ بیان ہے اور یہ میں اس لیے بیان کر رہا ہُوں کہ آپ کو میرے تجربوں سے فائدہ ہو اور آپ یہ سمجھ سکیں کہ غلط قسم کا تصوّف کونسا اور صحیح قسم کا تصوّف کونسا ہے۔

مجھے مُطلق یاد نہیں کہ مجھے تصوّف اور فقیری کا ذوق کب سے پیدا ہُوا۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ جب سے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا اپنے آپ کو فقر و تصوّف کے جال میں پھنسا ہُوا پایا۔ اس کی وجہ یہ ہُوئی کہ میرے دادا حضرت مولینا عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ

نہ صرف اپنے وقت کے ایک جیّد عالم دین بلکہ ایک بہت بلند پایہ ولی اللہ بھی تھے۔ مَیں نے اُنہی کی آغوشِ محبت میں آنکھ کھولی اور دس برس کی عمر تک انہی کے سایۂ شفقت میں پروان چڑھا۔ دادا صاحب کے پاس ہر قسم کے بزرگ آتے تھے اور دس پانچ تو ہر وقت موجود ہی رہتے تھے۔ ان میں مولوی بھی ہوتے تھے اور صوفی بھی۔ اوّل درجے کے متشرع بزرگوں سے لے کر رسول شاہیوں، قلندروں بلکہ ملنگوں تک ہر قسم کے لوگوں کو مَیں نے دیکھا اور اُن سے نادانستہ طور پر طرح طرح کا تاثر حاصل کیا۔ مَیں دس برس کا تھا کہ دادا صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت سے بیس برس کی عمر تک برابر اس کوشش میں رہا کہ کسی بزرگ سے بیعت ہو کر باقاعدہ سلوک طے کروں اور اس غرض سے سینکڑوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جہاں کسی اچھے بزرگ کی خبر سُنی وہیں پہنچا لیکن کہیں بھی طبیعت نہ جمی۔

دادا صاحب کے فیضِ تربیت اور تعلیم سے طبیعت میں توحید کا رنگ بہت گہرا ہو گیا تھا اور ایک ایسے بزرگ کی جستجو تھی جو شریعت کا پابند ہونے کے ساتھ ساتھ روشن خیال بھی ہو۔ تنگ خیالی سے مجھے بچپن ہی سے کوفت ہوتی تھی۔ مَیں صرف کشف و کرامات کو بزرگی کا ثبوت نہ جانتا تھا۔ مجھے تو ایسے بزرگ کی تلاش تھی جو صاحبِ علم، صاحبِ عرفان اور صاحبِ تحقیق ہو۔ کشف و کرامات دکھانے والے تو بہت مل جاتے ہیں لیکن عارف اور محقق کہاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ دس سال اسی بے چینی اور تگ و دو میں گزر گئے۔

اِن دس سالوں میں سینکڑوں فقیروں سے ملنا ہُوا۔ عجب عجب رنگ کے لوگ دیکھے۔ زیادہ تر تو ایسے لوگ ملے جو بالکل جھوٹے اور جعلساز تھے۔ فقیری کی الف بے تے بھی ان کو نہ آتی تھی۔ صرف لباس فقیرانہ تھا اور کچھ شعبدے اور چٹکلے جانتے تھے۔ کوئی روپیہ کو مٹھی میں بھینچ کر دُودھ نکال دیتا تھا۔ کوئی پانی

دم کرکے اُس کو میٹھا کر دیتا تھا۔ کوئی سونا اور چاندی بنا کر دکھا دیتا تھا۔ کوئی زیور اور نوٹ دُگنے کر دیتا تھا۔ دُنیا تھی کہ اُن کے شعبدوں کو کرامات سمجھ کر اس طرح ٹوٹی پڑتی تھی جیسے شہد پر مکھیاں۔ لیکن میں نے جب اُن کو قریب سے دیکھا اور رازہائے اندرونِ پردہ معلوم کیے تو یہ ظاہر ہُوا کہ وہ سب جھوٹے، دغاباز، انتہائی گندے اور بے ایمان بلکہ بدمعاش تھے۔ ان کے علاوہ ایک اور گروہ سے سابقہ پڑا۔ یہ لوگ عملیات اور تعویذ گنڈوں کے بل بوتے پر فقیری کرتے تھے۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کے تابع کوئی موکّل یا ہمزاد تھا۔ اِن کی سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ لوگوں کو کہیں سے کوئی چیز منگا دیتے تھے یا اُن کے گھر کی کوئی بات بتا دیتے تھے۔ اِن میں ایسے بدمعاش بھی تھے جو اپنے موکّل یا جن کو حکم دیتے کہ فلاں عورت کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ پھر خود عامل بن کر وہاں پہنچتے اور اُس خبیث کو اُتار کر خوب روپیہ بٹورتے۔ اِن میں کوئی ایسا بھی تھا جو اپنے موکّل کے ذریعے بیماروں کا مرض معلوم کرکے بیان کر دیتا اور پھر گنڈے تعویذ سے اس مرض کا علاج کرتا اور سینکڑوں روپے فیس لیتا۔ دہلی میں ایک ایسے ہی عامل کو میں نے دیکھا جس نے اس کام سے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کمایا اور سینکڑوں ایکڑ زمین خریدی۔ تعویذ گنڈے کرنے والوں میں خال خال ایسے لوگ بھی دیکھے جو نہایت نیک اور عبادت گزار تھے اور ان کے عملیات سے خلقِ خدا بہت فائدہ اٹھاتی تھی لیکن تصوّف اور سلوک سے یہ لوگ بھی بالکل نابلد اور محض ناآشنا تھے۔ مگر لوگ اِن کو ولی اللہ سمجھ کر ان سے مرید ہوتے اور خوب نذرانے دیتے تھے۔

ایک اور گروہ دیکھا یہ لوگ آبادی سے باہر تکیوں اور خانقاہوں میں رہتے تھے۔ شرع سے بالکل بے نیاز اور شرعی عبادات سے بالکل ناآشنا۔ دِن رات چرس کے دم لگاتے، بھنگ کے پیالے چڑھاتے اور ہر وقت ہو حق مچاتے تھے۔

یہ لوگ بدن پر بھبوت ملتے، ہاتھوں میں لمبے لمبے چمٹے اور سر پر بڑے بڑے بال رکھتے تھے اور اپنے آپ کو ملنگ اور قلندر کہتے تھے۔ مَیں نے اِن لوگوں میں بھنگ اور چرس کے سوا نشے اور کوئی بدچلنی یا بدکاری نہیں دیکھی اور اگر ہو تو خدا ہی جانتا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ ان میں سے بعض بعض میں بے پناہ روحانی قوت تھی۔ ایک ہی نظر میں انسان کا قلب جاری کر دیتے تھے۔ یہ بیماروں کا علاج بھی کرتے اور ایک چٹکی راکھ یا ایک گھونٹ پانی سے بڑی بڑی پُرانی بیماریاں منٹوں سیکنڈوں میں دُور ہو جاتی تھیں۔ ان میں کشف بھی اعلےٰ درجہ کا تھا۔ ماضی کا حال ایسے بیان کرتے جیسے آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ مستقبل کی بابت پیشین گوئیاں بھی کرتے جو اکثر ٹھیک ہوتی تھیں۔ انکی طرف میرے دِل نے بہت رجوع کیا لیکن دادا صاحب کی دی ہوئی تعلیم آڑے آئی اور مَیں نے باوجود اِن کرامات کے اِن سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی۔

ایسے لوگ بھی دیکھے جو بڑے پاک باز عابد و زاہد اور مرتاض تھے۔ یہ دُنیا سے الگ پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتے اور دِن رات اللہ اللہ کرتے تھے۔ یہ واقعی بزرگ تھے۔ کشف و کرامات ان کے لیے بہت معمولی بات تھی۔ میرے دِل میں اب بھی ان کی عزت و محبت اور بڑی قدر و منزلت ہے لیکن ان میں بھی ایک نقص تھا۔ یعنی اُن کی زندگی رہبانیت کی زندگی تھی اور رہبانیت خلافِ اسلام ہے۔ اس لیے مَیں نے ان سے ملنا اور اِن کے پاس جانا بھی چھوڑ دیا۔

ان کے علاوہ ایک اور جماعت سے شرفِ نیازمندی حاصل ہُوا۔ یہ علمائے دین کی جماعت تھی۔ یہ بھی صوفیوں کی طرح عوام کو بیعت کرتے اور ہزارہا مریدوں کو ہدایت فرماتے تھے۔ لیکن ان میں سے خال خال ہی ایسے تھے جو تصوّف والی روحانیت کے حامل ہوں۔ زیادہ تعداد ایسے بزرگوں کی تھی جو صرف تقویٰ و عبادت کے لیے بیعت کرتے تھے یعنی صرف صاحبِ قال تھے صاحبِ حال نہ تھے۔ بہرحال

اس جماعت کے پاس بھی میرے دردِ دل کا مداوا نہ تھا۔ تاہم میں ان کے کام کو عوام کے لیے مذہبی نقطۂ نظر سے بہت اہم اور لازمی سمجھتا ہوں۔

ایک ایسی جماعت بھی دیکھی جو سرتاپا تصوّف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کے افراد ہر لحاظ سے صوفی اور بزرگ نظر آتے تھے۔ میرا اشارہ اُن پیروں اور بزرگوں کی طرف ہے جو بڑی بڑی درگاہوں اور آستانوں کے سجادہ نشین تھے۔ ان میں کثیر تعداد ایسے پیروں کی تھی جو صرف ظاہری رکھ رکھاؤ اور آستانوی شان و شوکت کی وجہ سے مرجعِ خلائق تھے۔ ورنہ حقیقتاً روحانی طاقت اور معرفت و حقیقت کے لحاظ سے صفر ہی تھے۔ ہاں! جہاں تک کتابی مسائل تصوّف کا تعلق ہے۔ خاصہ اچھا علم رکھتے تھے۔ پھر بھی اس جماعت میں کئی بزرگ ایسے ملے جو تصوّف کے ظاہری علم کے ساتھ ساتھ باطنی دولت سے بھی مالا مال تھے اور انہی میں سے بعض بعض کو علمِ معرفت بھی خوب حاصل تھا۔ ان بزرگوں میں سے کسی نہ کسی سے میں ضرور بیعت ہو جاتا۔ لیکن ایک بات مانع ہوئی اور وہ تھی اُن کی دربارداری، دنیوی شان و شوکت اور کرّوفر۔ فقیرانہ سادگی ایک جگہ بھی نظر نہ آئی۔ ہر ایک آستانہ کے ساتھ صاحبِ آستانہ کے آباؤ اجداد کی ایک دو قبریں ضرور تھیں جن کا احترام اس قدر کیا جاتا تھا جو کعبہ کے احترام سے بھی بڑھ جاتا تھا اور پوجا کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ بہت سے آستانوں کے صاحبانِ سجادہ ان قبروں سے بھی زیادہ پوجے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کو باقاعدہ سجدے کیے جاتے تھے۔ اور یہ سب باتیں اُس تعلیم کے خلاف تھیں جو مجھے ملی تھی۔

مختصر یہ کہ دس برس اسی تلاش و طلب میں گزر گئے۔ لیکن اس زمانہ میں جو علم اور تجربہ فقیری کی بابت ہُوا وہ بہت ہی بیش قیمت تھا۔ بزرگوں اور فقیروں کی ملاقات کے علاوہ اُسی زمانہ میں تصوّف کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔

دادا صاحب مرحوم ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی چھوڑ گئے تھے جس میں کم و بیش

دو ہزار کتابیں سیر و سلوک اور تصوّف پر تھیں۔ ان میں سے کئی سو کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اگرچہ بہت سی کتابیں مطلق سمجھ میں نہ آئیں تاہم کچھ نہ کچھ علم تو حاصل ہو ہی گیا۔ آخرکار اس تلاش و طلب کا نتیجہ نکلا اور بہت اچھا نکلا۔ سچ ہے دیر آید درست آید۔ مطلب یہ کہ اچانک اور اتفاقاً حضرت مولانا کریم الدین احمد رحمت اللہ علیہ سے ملاقات ہوگئی۔

پہلے ہی دن میں حضرت مولاناؒ کی خدمت میں چھ گھنٹے حاضر رہا اور بیعت ہو کر ہی اُٹھا۔ حضرت صاحب نے فرمایا بھی کہ دو چار ماہ ہماری صحبت میں رہو اور ٹھوک بجا کر پرکھ لو۔ پھر بیعت ہونا۔ مگر میں نے عرض کیا خدا جانے پھر وقت اور موقعہ ملے نہ ملے۔ جو کچھ مجھے دیکھنا تھا دیکھ لیا۔ مہربانی فرمائیں اور مجھے بیعت کر لیں۔

مولانا نے دریافت فرمایا:

"کس غرض سے بیعت ہونا چاہتے ہو"؟

مَیں نے عرض کیا۔

"تین مقاصد ہیں: اوّل روحانی طاقت، دوسرے تزکیۂ اخلاق، تیسرے دیدار باری تعالیٰ"۔

مولانا نے فرمایا:

"پہلی دو چیزیں تو تم کو میرے ذریعہ سے مل جائیں گی لیکن تیسری چیز یعنی دیدار باری تعالیٰ میرے بس کی بات نہیں۔ اس کے بدلے میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ معرفتِ باری تعالیٰ کسی نہ کسی قدر حاصل ہو جائے گی"۔

مَیں نے عرض کی کہ "دیدارِ خدا ممکن بھی ہے"۔ مولانا نے فرمایا "ممکن کیوں نہیں۔ رسول اللہؐ کو حاصل ہُوا۔ حضورؐ کے صحابہ کبار کو میسّر آیا۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ "مَیں دِل کی آنکھ سے اللہ کو دیکھتا ہوں"۔ پھر حضور کی اُمّت اس سے کس طرح محروم رہ سکتی ہے۔ اکابر اولیاء جتنے بھی گزرے ہیں سبھی جیتے جی

اپنے ربّ کے دیدار سے مشرف ہوئے۔ لیکن اللہ کا دیدار ان ظاہری آنکھوں سے نہیں ہوتا بلکہ ایک باطنی آنکھ پیدا ہو جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنی طاقت کے مطابق یقیناً دیکھتی ہے اور اسی کے بعد ہی ایمان کا وہ درجہ نصیب ہوتا ہے جس میں کبھی کمی اور شک پیدا نہیں ہو سکتا"۔

اس پر میں نے پوچھا کہ "آپ اتنا بتا دیں کہ یہ دولت میری قسمت میں ہے بھی یا نہیں"۔ مولانا نے تھوڑی دیر سکوت فرمانے کے بعد کہا "ہاں تمہارے دِل میں اللہ تبارک تعالیٰ نے ایک ایسی چیز پیدا کی ہے کہ جب تک تم زندگی میں خدا کو نہ دیکھ لو گے مرو گے نہیں"۔

میں نے عرض کی۔ "اتنا اور بتا دیں کہ کس عمر میں یہ دولت حاصل ہو گی"۔ مولانا نے فرمایا۔ "ساٹھویں سال میں"۔ میں نے پوچھا "آپ اُس وقت حیات ہوں گے"۔ جواب دیا۔ "واہ میری تو قبر کا نشان بھی اس وقت نہ ہو گا"۔ میں نے کہا "پھر یہ چیز کس کے توسّل سے ملے گی"۔ جواب دیا کہ "میاں صاحبزادے ایک گندم کا دانہ یا ایک قطرہ پانی جو تمہارے حلق سے نیچے اُترتا ہے اس پر تمہارا نام لکھا ہوتا ہے اور اللہ کے حُکم اور قضا و قدر کے انتظام سے تم تک پہنچایا جاتا ہے۔ تو کیا یہ روحانی دولت اس قدر سستی اور بے حیثیت چیز ہے کہ یونہی بغیر اللہ کی مرضی کے جس کا دِل چاہے وہ حاصل کر لے۔ یہ بھی اللہ کے حکم اور فضل ہی سے ملتی ہے اور جس کو وہ نوازنا چاہے اُس کے لیے ہزار وسیلے بھی پیدا کر دیتا ہے۔ تم کو بھی کوئی ایسا بزرگ مِل جائے گا جس کی تعلیم اور صحبت سے تمہارے اندر وہ صلاحیتیں پیدا ہو جائیں گی جو جیتے جی اللہ کا دیدار حاصل کرنے کے لیے لازمی ہوتی ہیں"۔ اس پر میں نے بڑی بے صبری اور عاجزی سے دریافت کیا کہ "وہ باتیں کون کون سی ہیں جن سے یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ کچھ بیان فرما دیں تاکہ میں ابھی سے وہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کروں"۔

مولانا : صرف دو باتیں ، پہلی بات تو تزکیہ اخلاق ہے۔
دوسری بات یہ ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر اللہ کے ہو جاؤ۔ جیسا کہ سورۂ مزمل میں خود
اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ط
مَیں : قبلہ اِس سے تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ذرا تفصیل سے ارشاد فرمائیں۔
تزکیۂ اخلاق سے کیا مُراد ہے ؟
مولانا : مفصّل تو بہت وقت طلب ہے مختصر یوں سمجھئے کہ دُنیا میں دو چیزیں ہیں :
خیر و شر۔ نیکی بدی ، بُرائی بھلائی یا گناہ و ثواب ان میں سے آپ جہاں تک ہو سکے
بُرائی کو کم کریں اور بھلائی یا نیکی پر عمل زیادہ کرتے جائیں۔ جیسے جیسے بُرائی کم اور نیکی
زیادہ ہوتی جائے گی۔ آپ کا ذہن اور آپ کی رُوح لطیف اور پاکیزہ ہوتی جائے گی۔
یہاں تک کہ جب کبیرہ گناہوں سے آپ بالکل محفوظ ہو جائیں گے تو آپ کے قلب میں پہلا
درجہ اُس صلاحیت کا پیدا ہوگا جو اللہ کی صفاتی تجلیات کے مشاہدہ کے لیے
ضروری ہے اور جب آپ یہاں تک صفائی قلب کر لیں گے کہ بُرائی کا خیال بھی
ذہن میں نہ آئے تو آپ کے قلب میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی کہ اللہ کی ذات
کو اپنی صلاحیت کی مقدار کے لحاظ سے کم یا زیادہ مشاہدہ کر سکے۔
میں : مگر قبلہ یہ تو بہت مشکل کام ہے۔
مولانا : ہاں ہے تو مشکل۔ مگر برخوردار من خدا کا دیدار بھی تو معمولی چیز نہیں۔
دُنیا کے کسی معمولی حاکم یا گورنر وغیرہ کے حضور میں جانا ہو تو اُس کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا
پڑتا۔ تو خدا تک پہنچنے اور اُس کا مشاہدہ کرنے کے لیے تو اگر جان بھی دینی پڑے تو کچھ
بڑی بات نہیں۔
میں : تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے ؟
مولانا : سچّی طلب اور تڑپ اور اَن تھک محنت سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔

مَیں : قبلہٗ مجھے تو صاف الفاظ میں یہ بتا دیں کہ تزکیۂ اخلاق کے لیے کیا کیا کرنا چاہیئے۔

مولانا : اچھا سنئے۔ پہلی بات تو یہ کہ پانچ وقت نماز کے پابند رہو۔

دُوسری بات یہ کہ ذکر جتنا بھی زیادہ ہوسکے کرو۔ ذکر سے مُراد یہ ہے کہ زبان سے اللہ اللہ کہو اور دِل میں اُس کی یاد مستقل طور پر قائم کرلو۔

تیسری بات یہ کہ دُنیا کے تمام حقوق خوشی سے پُوری طرح ادا کرو۔ کراہت اور مجبوری سمجھ کر نہیں بلکہ خوشی سے ادا کرو۔ انہی میں تمہارے منصبی فرائض بھی شامل ہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ طبیعت میں عاجزی اور فروتنی پیدا کرو۔ اپنے آپ کو کسی سے افضل اور کسی دُوسرے کو اپنے سے کمتر یا ذلیل نہ سمجھو۔

پانچویں بات خلقِ خدا سے محبت کرو۔ اور کسی کو اپنی کسی حرکت سے رنج نہ پہنچاؤ۔

مَیں : بجا فرمایا جزاک اللہ۔ اب کچھ تَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلاً کے متعلق ارشاد فرمائیں کہ وہ کس طرح کیا جاتا ہے۔

مولانا : اِس کو تصوّف کی اصطلاح میں ترک ماسویٰ اللہ کہتے ہیں۔ اِس کا مطلب بہت سے بزرگوں نے یہ لیا کہ دُنیا اور دُنیا والوں سے بالکل قطع تعلق کرکے جنگلوں اور پہاڑوں میں جا بیٹھو اور ہر وقت اللہ کے ساتھ مشغول رہو۔ چنانچہ اُنہوں نے ایسا ہی کیا اور بڑے بڑے مراتب پائے۔ لیکن باوجود ازیں وہ غلطی پر تھے۔ کیونکہ ایک مُسلمان کو فہم قرآن کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کے ہر حکم و ہدایت کو رسول اللہؐ کی زندگی اور حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں سمجھے۔

اَب ہم حضور اکرمؐ کی زندگی پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں تو صاف نظر آتا ہے کہ حضورؐ نے تو یہ کبھی بھی نہیں کیا کہ دُنیا سے بالکل بے تعلق ہو کر راہبانہ زندگی بسر کی ہو بلکہ حضورؐ نے تو ہمیشہ ایک متاہل زندگی بسر کی اور اُس کے ساتھ عوام کی ہدایت و خدمت

میں بھی ہمیشہ مصروف رہے۔ حضورؐ نے ملازمت بھی کی، تجارت بھی کی، مزدوری بھی کی اور بادشاہت بھی کی۔ حضورؐ ایک بہترین شوہر، بہترین باپ اور بہترین دوست تھے۔ حضورؐ اعلیٰ درجے کے قانون ساز، حاکم و ناظم اور جج بھی تھے۔ یہی نہیں بلکہ آپ ایک اوّل درجے کے سپاہی اور بے مثال جرنیل بھی تھے۔ اور ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ آپ کا دلی تعلّق سوائے خدا کے اور کسی چیز کے ساتھ نہ تھا۔ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے ایک سیکنڈ کے لیے خدا کی یاد سے غافل نہ ہوتے تھے۔ اسی کا نام ہے ترکِ ماسویٰ اللہ۔

مَیں: سبحان اللہ۔ مگر قبلہ یہ تو بہت ہی مشکل بات ہے۔

مولانا: پھر وہی۔ برخوردار جتنا عظیم و عالی شان مقصد ہوتا ہے اُتنی ہی زیادہ مشکلات اُس کے حصول میں پیش آتی ہیں۔ اگر خس و خاشاک اور کنکر پتھر اکٹھے کرنے ہوں تو گھر سے باہر نکلو اور فوراً گٹھڑی باندھ کر لے آؤ۔ لیکن اگر کان میں سے سونا حاصل کرنا ہو تو معلوم ہے کس قدر مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ اگر مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں ہے تو اِس راہ میں قدم ہی نہ رکھو۔ کس نے آپ سے کہا ہے کہ بیٹھے بٹھائے آرام و آسائش کی زندگی چھوڑ کر اس بکھیڑے میں پڑو اور اپنی جان کو روگ لگاؤ۔

مَیں: بالکل بجا فرمایا۔ اچھا تو اب مجھے بیعت کر لیں۔

مولانا: اِن تمام باتوں کو جان لینے کے بعد بھی آپ بیعت ہونا چاہتے ہیں۔

مَیں: جی ہاں۔

مولانا: اچھا! ایک بات اور بتائیے کہ آپ محض روحانی ترقی کے لیے بیعت ہو رہے ہیں۔ دنیوی ترقی کا تو کوئی خیال مدِّنظر نہیں۔

مَیں: جی نہیں۔

مولانا: دِل کو خوب ٹٹول لو۔ کبھی یہ خیال ہو کہ ہمارے مرشد بہت بڑے بزرگ ہیں۔ کرامات کے زور سے لکھ پتی بنا دیں گے، سونا بنانا بتا دیں گے یا دستِ غیب سکھا دیں گے۔ اگر اس قسم کا ذرا سا بھی کوئی خیال ہے تو خوب کان کھول کر سُن لو کہ مجھے ان چیزوں میں سے کسی پر بھی قدرت حاصل نہیں۔ دُوسری بات یہ کہ اگر دنیوی فوائد کا ذرا سا خیال بھی دِل میں ہے اور زبان سے آپ اس کا انکار کر رہے ہیں تو آپ جھوٹے ہیں، منافق ہیں اور ایسے آدمی کو روحانیت تو کیا نصیب ہوگی آخر میں سخت گھاٹا اور نقصان ہی رہے گا۔ اب فرمایئے کیا ارادہ ہے؟

مَیں: بیعت فرما لیجیے۔

مولانا: بہت اچھا۔

اس کے بعد مولانا نے اپنی جیب سے کچھ پیسے دے کر مٹھائی منگوائی اور مجھے بیعت کر لیا۔ مولانا سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگ تھے۔ بہت مختصر سا ذکر وغیرہ کرنے کو بتایا۔ وہی جو میں آپ حضرات کو بتایا کرتا ہوں یعنی چوبیس گھنٹے پاس انفاس اور کسی ایک نماز کے بعد نفی اثبات فرق صرف یہ ہے کہ مولانا نے مجھ کو پانچ ہزار مرتبہ نفی اثبات کا ذکر بتایا تھا اور مَیں آپ کو ایک تسبیح سے لے کر زیادہ سے زیادہ پانچ تسبیح تک بتاتا ہوں۔ تعجب یہ ہے کہ خاندان نقشبندیہ میں ذکر بالجہر منع ہے لیکن مولانا نے مجھے ذکر بالجہر ہی بتایا تھا۔ اس کے علاوہ تزکیۂ اخلاق کی ہدایت کی تھی۔

بیعت ہونے کے بعد میں نے بڑی جانفشانی اور جوش و خروش سے تین برس متواتر اپنے اوراد جاری رکھے۔ اور اِن تین برسوں میں اللہ کے فضل و کرم سے تین لطیفے قلب۔ رُوح اور سر روشن ہو گئے اور اُن کے دوائر کی سیر بھی میسر آ گئی۔ اس پر مولانا نے مجھے مبارک باد دی اور تحریری اجازت بیعت کرنے کی عطا فرمائی۔ اس وقت میری عمر بمشکل ۲۳ برس کی ہوگی۔ بدیں وجہ مولانا نے اجازت نامہ میں یہ لکھ دیا کہ

اگرچہ بیعت کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ لیکن جب تک چالیس سال کی عمر نہ ہو جائے کسی کو بیعت نہ کرنا۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہدایت کی کہ اب تم نوافل تہجد پر بہت زور دو اور جس قدر زیادہ ممکن ہو تلاوت اور تفکر یعنی مراقبے میں وقت گزارا کرو۔ اس صحبت کے بعد حضرت مولانا سے بہت دفعہ ملاقات ہوئی یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

اب مجھ کو یہ بتانا چاہیئے کہ مولانا کی تعلیم کیا تھی۔ لیکن اس سے پہلے یہ بتا دینا بہت ضروری ہے کہ جب دس سال تک میں بڑے بڑے بزرگوں سے ملتا رہا اور ان میں سے کسی کے ہاتھ پر بیعت نہ کی تو مولانا کریم الدین احمد رحمت اللہ علیہ میں وہ کونسی خوبی تھی کہ پہلی ہی ملاقات اور پہلی ہی نشست میں اُن سے بیعت ہو گیا۔ تو وجہ اُس کی یہ ہوئی کہ میں نے اپنے دادا حضرت رحمت اللہ علیہ سے جو خوبیاں اور نشانیاں ایک اچھے بزرگ کی سُنیں اور کتب تصوّف میں پڑھی تھیں۔ حضرت مولانا میں وہ سب کی سب موجود تھیں۔

اوّل تو یہ کہ وہ شریعت کے بہت سخت پابند بلکہ شریعتِ مجسّم تھے۔

دُوسرے یہ کہ وہ نہ صرف ایک جیّد عالم دین تھے بلکہ دُنیوی علوم حاضرہ میں بھی کافی دسترس رکھتے تھے۔

تیسرے یہ کہ اُن کا اخلاق بہت ہی اچھا تھا۔ غریب اور امیر، بادشاہ اور فقیر سب کو ایک نظر سے دیکھتے اور اس قدر نرمی، پیار، تواضع اور خلوص سے ملتے جس کی نظیر ملنی مشکل تھی۔

چوتھے یہ کہ آپ نہایت سادہ مزاج تھے اور بہت ہی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ دہلی سے کوئی پچیس تیس میل جنوب میں "دھوج" نامی ایک قصبے کے باہر ایک کچا احاطہ تھا جس میں تین چار چھپر پڑے ہوئے تھے۔ یہی مولانا کا کاشانہ تھا۔ دو چار میو خدمت کیا کرتے تھے اور روٹی وغیرہ پکا دیتے اور دُوسری خدمات انجام

دیتے تھے۔ مولانا صرف ایک جوڑا کپڑا کھدر کا رکھتے تھے جس کو وہ ہر جمعہ کے دِن نماز سے پہلے خود دھو کر پہن لیتے تھے۔ ہر چھ ماہ بعد ایک نیا جوڑا بناتے اور پُرانا جوڑا کسی غریب کو دے دیا کرتے۔

مولانا کے بال بچّے بڑی عمر کے تھے اور سب اپنے اپنے گھروں میں خوش تھے۔ مولانا پر کسی کا بوجھ نہ تھا وہ اکیلے ہی رہتے تھے۔ مہینے میں ایک مرتبہ جمعہ کی نماز کے لیے دہلی تشریف لاتے اور بعض اوقات پندرہ بیس دِن تک قیام فرماتے۔

آپ ہمیشہ چاندنی چوک کے کسی بہترین ہوٹل میں ٹھہرتے اور دو تین کمرے کرایہ پر لے لیتے۔ یہاں ہر وقت مریدوں کا تانتا لگا رہتا اور مولانا خود سب کو کھانا کھلاتے۔ مَیں نے مولانا کو کبھی کسی دعوت میں جاتے نہیں دیکھا۔

مولانا مشہور بالکل نہ تھے بلکہ ایک گمنام بزرگ اور ہر لحاظ سے کامل فقیر تھے۔ مولانا کسی گدّی یا خانقاہ کے سجادہ نشین نہ تھے۔ وہ قبروں بلکہ بڑے بڑے مزاروں پر جانے کو بھی اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ بزرگوں کا بڑا احترام کرتے لیکن خدا کے سوا مشکل کشا کسی کو نہ مانتے تھے۔ غرض یہ کہ وہ ایک بہت پکّے موحّد تھے۔ موحّد میں نے غلط کہا، موحّد نہیں بلکہ پکّے توحیدی تھے۔

آپ کو موحّد اور توحیدی کا فرق معلوم ہے؟ موحّد آج کل کے تصوّف کی اصطلاح میں اُس شخص کو کہتے ہیں جو وحدت الوجود یعنی "ہمہ اوست" کا قائل ہو۔ یعنی یہ سمجھتا ہو کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہے اور جتنی چیزیں نظر آتی ہیں یہ بھی خدا ہی کی تجلیات ہیں۔ یہ عقیدہ چونکہ تعلیم قرآن کے خلاف ہے۔ اس لیے میں "توحیدی" کا لفظ استعمال کرتا ہوں۔ روحانی طاقت اور کشف و کرامات کے لحاظ سے بھی مولانا عدیم المثال نہیں تو فقید المثال ضرور تھے۔

مجھے جو مولانا کی بات سب سے زیادہ پسند آئی وہ اُن کی سادگی اور جدید علوم سے واقفیت تامّہ تھی۔ وہ بڑے بڑے اُلجھے ہوئے مسائل حیات اور مسائل الٰہیات کو ایسے

دلکش اور معمولی بات چیت کے انداز میں بیان فرماتے تھے کہ بڑے بڑے فلاسفروں اور ڈاکٹروں سے لے کر معمولی سے معمولی تعلیم یافتہ آدمی بھی آسانی سے سمجھ جاتے تھے۔ مولانا صرف شراب طہوری پلانے والے ساقی ہی نہ تھے۔ بلکہ تشنگان علم و ادب کی پیاس بجھانے والے دریا بھی تھے۔ موجودہ زمانے کے مسائل حیات پر مولانا کی نظر بہت گہری تھی۔ وہ صرف اللہ اللہ ہی نہیں سکھاتے تھے بلکہ یہ بھی بتاتے تھے کہ دنیا میں آرام و سکون اور عزت و ترقی کی زندگی بسر کرنے کا راز کیا ہے۔

علّامہ اقبال کے بڑے مدّاح تھے۔ مولانا سے ایک دو مرتبہ قوم کے زوال اور موجودہ زبوں حالی پر گفت گو ہوئی تو مولانا نے کئی گھنٹے اس قدر سیر حاصل بحث اس موضوع پر کی کہ سننے والے جن میں سب کے سب انگریزی تعلیم یافتہ اور کئی پی۔ایچ ڈی تھے عش عش کر اُٹھے۔

مولانا نے جو کچھ فرمایا وہ سب کا سب بیان کرنا تو اِن صفحات میں ممکن نہیں۔ ہاں تصوّف کے نقطۂ نظر سے جو کچھ فرمایا اس میں سے جو کچھ اس وقت یاد آ رہا ہے اس کے بیان کرنے میں مضائقہ نہیں۔ بلکہ کچھ مفید ہی معلوم ہوتا ہے۔

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ صوفیوں اور فقیروں کی قسمیں تو ہزاروں ہیں لیکن تصوّف کی قسمیں صرف دو ہیں: ایک صحوی، دوسری سکری۔

صحوی تصوّف کے معنی ہیں تصوّف بیدار۔ سکری تصوّف کے معنی ہیں تصوّف خفتہ۔ جب تک کسی قوم کے صوفیوں میں تصوّف بیدار کارفرما ہوتا ہے وہ قوم برابر ترقی کرتی رہتی ہے۔ اس قوم میں زندگی، خوشی، خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم کے صوفی یعنی روحانی علماء زندگی کے تمام رازہائے سربستہ اور انسانی فطرت سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ اور یہی تعلیم وہ اپنے مریدوں اور اپنی قوم کو دیتے ہیں۔ تصوّف بیدار صوفی میں دانشمندی، فراست اور

دانشوری پیدا کرتا ہے۔ ایسے صوفی بین الاقوامی مسائل اور اپنے معاشرے اور قوم کی خوبیوں اور خامیوں سے خوب اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ وہ آئندہ صدیوں تک آنیوالے واقعات اور انقلابات کو اس طرح دیکھتے اور سمجھتے ہیں جیسے روزِ روشن میں یہ سب اُن کی آنکھوں کے سامنے موجود ہوں۔ یہ لوگ آئندہ پیش آنے والے واقعات کو کشف سے کم لیکن اپنے علم و فراست سے زیادہ معلوم کرتے ہیں اور اپنی قوم کے لیے اپنے علم و فراست کی روشنی میں ایک ایسا لائحہ عمل اور دستور پیش کرتے ہیں کہ اگر قوم اس پر کاربند رہے تو دُوسری قوموں سے کبھی شکست نہیں کھا سکتی۔ اُس کو ہرگز زوال نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ دِن دونی رات چوگنی ترقی کرتی رہتی ہے۔

اسلام کے پہلے تیس سالہ دَور میں ترقی کا موجب رُسولِ اکرمؐ کا پیش کردہ دستور العمل ہی تھا۔ حضور اکرمؐ نے مکتبی تعلیم بالکل نہیں پائی تھی۔ باوجود ازیں آپ انسان کے معیشتی اور معاشرتی مسائل کو جتنی اچھی طرح سمجھتے اور جانتے تھے کیا کوئی بڑے سے بڑا فلاسفر یا عالم اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ ان مسائل کو رسُولِ خداؐ سے زیادہ اچھی طرح سمجھتا اور جانتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم حقیقتِ ذات و صفات باری تعالیٰ کی معرفت کے ساتھ ساتھ حقیقت الاشیاء اور حقیقتِ فطرت انسانی کا اتنا وسیع عرفان رکھتے تھے جو دُنیا میں کسی اور انسان کو نہ کبھی حاصل ہوا اور نہ آئندہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی حضورؐ کو تائید الٰہی بھی حاصل تھی۔ یعنی وحی بھی ہوتی تھی۔ پھر حضورؐ سے اچھا دستور العمل انسان کے لیے کون پیش کر سکتا تھا یا کر سکتا ہے۔ دُنیا کی جتنی قومیں اس وقت ترقی کے نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی ہیں۔ سب کے معاشرتی اور معیشتی قوانین و قواعد پر غور سے نظر کرو تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ان سب نے اسلام ہی کے قوانین و قواعد کو اپنا رکھا ہے۔ لیکن افسوس اور رونا اس بات کا ہے کہ مسلمانوں نے صرف تیس چالیس برس

حضورؐ کی تعلیم پر عمل کیا۔ اِس کے بعد تاریخ شاہد ہے کہ جیسے جیسے مسلمان حضور اکرمؐ کے بنائے ہوئے دستور العمل سے ہٹتے گئے اُن پر زوال آتا گیا۔ یہاں تک کہ آج ہم جیسے کچھ مسلمان ہیں اور اسلام کی تعلیم پر جیسا کچھ عمل کر رہے ہیں اور دُنیا میں ہماری جو کچھ حیثیت دوسری اقوام کے مقابلہ میں ہے وہ ظاہر و باہر ہے۔

مولاناؒ فرمایا کرتے تھے کہ رسولِ خداؐ دُنیا کے نہ صرف سب سے بڑے صوفی بلکہ تمام گذشتہ اور آئندہ صوفیوں کے سردار تھے۔ اگر کوئی شخص حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صوفی نہیں سمجھتا تو سمجھ لو کہ وہ جاہل ہے تصوّف کو نہیں جانتا۔

صوفی ہونے کے لیے جتنی شرطیں ضروری ہیں۔ رسولِ اکرمؐ میں وہ سب بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ صوفی موٹے جھوٹے بلکہ اُونٹ کے بالوں سے بُنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ حضورؐ بھی کملی پوش تھے۔ اللہ نے بڑے لاڈ سے سورۂ مزمّل میں حضورؐ کو کملی والا کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ صفائے قلب، تزکیۂ اخلاق، خوش خلقی، عاجزی، انکساری، مساوات سب صوفیوں کی صفات ہیں اور یہ سب رسولِ خدا میں بدرجۂ کمال موجود تھیں۔ روحانی طاقت و کشف و کرامات یعنی معجزات میں حضورؐ فرد تھے اور ہمیشہ فرد ہی رہیں گے۔ آخری زمانہ میں حضورؐ کے پاس مالِ غنیمت سے اتنی دولت آئی تھی کہ حضورؐ کے برابر عرب میں کوئی مالدار ہی نہ تھا خود اللہ تعالےٰ نے سُورۃ والضحیٰ میں فرمایا ہے:

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ۔

یعنی کیا ہم نے نہیں پایا تم کو تنگ دست اور نہیں کر دیا تم کو مالدار۔"

لیکن باوجود اس افراطِ دولت کے حضورؐ کا یہ حال تھا کہ جتنا مال اور سونا چاندی کسی دِن حضورؐ کو ملتا وہ سب کا سب شام کا سُورج غروب ہونے سے پہلے غریبوں اور حاجتمندوں کو دے ڈالتے اور خود اکثر فاقے سے رہتے۔ کیا یہ صوفیوں کی سنّت اور عادت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں جب سارا عرب مسلمان ہوگیا تو حضورؐ تمام ملک کے بادشاہ یا حاکم مطلق تھے۔

حضورؐ کے حکم کے خلاف کوئی نظر بھی نہ اُٹھا سکتا تھا۔ لیکن حضورؐ نے اپنی اس حیثیت سے کبھی ذاتی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ حضورؐ بادشاہ ہو کر بھی فقیر ہی رہے۔ نہ صرف اپنا بلکہ غریب سے غریب لوگوں کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ معمولی لباس زیب تن فرماتے، چٹائی پر سوتے، کمبل اوڑھتے اور ہر وقت خدمتِ خلق میں مصروف رہتے۔ کیا یہ سب باتیں صوفیوں اور تصوّف کی شرائط اور لوازمات سے نہیں ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ حضورؐ صوفی نہ تھے۔

ہاں! یہ ضرور ہے کہ حضورؐ کا تصوّف، تصوّفِ بیدار تھا اور یہ اسی کی برکت ہے کہ آج اس سطح زمین پر ساٹھ کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ لیکن اگر یہ مسلمان دوسری اقوامِ عالم کے مقابلہ میں کمزور ہیں تو اُس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہزار یا رہ سو سال سے مسلمان صوفیوں نے تصوّفِ بیدار کو چھوڑ کر تصوّف خفتہ کو اپنا لیا ہے۔

تصوّفِ خفتہ کی بابت مولانا فرماتے تھے کہ یہ انسانیت کی افیم ہے۔ خفتہ تصوّف والے صوفی فرشتہ تو بن سکتے ہیں لیکن انسان نہیں رہتے۔ مَیں نے ایک مرتبہ پوچھا کہ قبلہ یہ خفتہ تصوف کیا ہے اور خفتہ تصوّف والے صوفی کون ہیں۔

فرمایا کہ آج کل تو ہزار سچّے صوفیوں میں سے ۹۹۹ خفتہ صوفی ہی ہیں۔ ان کو نہ خدا کا پتہ ہے کہ وہ کیا ہے اور اس کی صفات کیسے کام کرتی ہیں۔ نہ اشیاء کی معرفت حاصل ہے، نہ انسانی فطرت کی خبر ہے۔ نہ زندگی کے راز سے باخبر ہیں، نہ دورِ حاضرہ کے مسائل سے واقف ہیں۔ ہر وقت روحانی کیف و استغراق میں مدہوش و مبتلا۔ "لا اور بلا" لا اور بلا" کی تکرار میں کھوئے رہتے ہیں۔ ان کو اپنا ہی پتہ نہیں، دُوسروں کی کیا اصلاح کریں گے اور قوم کو سیدھا راستہ کیا بتائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض بعض میں بہت بڑی روحانی طاقت و قدرت ہوتی ہے۔ وہ مُردے زندہ کر سکتے ہیں۔ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں۔

لیکن یہ سب بیکار ہے ۔ جتنے پیغمبر دُنیا میں آئے سب کے سب اپنی قوم کی ہدایت اور خدمت کے لیے آئے تھے ۔ اُن پیغمبروں کو اللہ نے ہر قسم کی صلاحیتیں اور بے پناہ طاقتیں دی تھیں لیکن سبھی نے ان طاقتوں اور صلاحیتوں کو اپنی قوم کی اصلاح اور بہبودی کے لیے صرف کیا ۔ کسی ایک نے بھی خود کوئی ذاتی فائدہ نہیں اُٹھایا ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس صوفی یا بزرگ میں اس قسم کی طاقتیں ہوں اور وہ اُن کو اجتماعی طور پر قومی اصلاح و فلاح کے لیے صرف نہ کرے خود ہی مزے لوٹتا رہے وہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا سچّا پیرو کار نہیں ہے ۔ اور یہ لوگ انفرادی طور پر جو کچھ فائدہ دُعا یا کرامات کے زور سے پہنچاتے بھی ہیں وہ کوئی خاص قابلِ قدر چیز نہیں ہے ۔ بلکہ اس سے تو قوم کو اُلٹا نقصان پہنچتا ہے ۔ لوگ اللہ کو چھوڑ کر خود اُنہی کی پرستش شروع کر دیتے ہیں ۔ ان کے مرنے کے بعد اُن کی قبریں پوجتے ہیں اور قوم اسلام سے ہٹتے ہٹتے مشرک ہو جاتی ہے ۔ اس سے زیادہ نقصان اور کیا ہو گا ۔

الغرض! یہ تھی حضرت مولانا کریم الدین احمد رحمت اللہ علیہ کی تعلیم جو وہ مجھے اور دُوسرے مریدوں کو دیا کرتے تھے ۔ اس تعلیم کا بہت مختصر سا لب لباب میں نے آپ کے سامنے بیان کر دیا ہے ۔ اور محض اس لیے کیا ہے تاکہ آپ کی سمجھ میں آجائے اور آپ کو معلوم ہو جائے کہ تصوّف میں میرا رنگ اور میرے عقائد کیا ہیں اور میں آپ لوگوں کو کیا سکھانا اور کیا بتانا چاہتا ہوں ۔ اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ میں تم سب کو بیدار بلکہ زندہ صوفی بنانا چاہتا ہوں ۔ جو لوگ میری اس تعلیم پر عمل کریں گے دین و دُنیا میں سرخرو ہوں گے اور جو اس سے برگشتہ ہو کر صرف شراب طہوری کے نشہ میں بے خودی اور سرمستی کے مزے لوٹتے رہیں گے ۔ وہ آخر کار خراب و خوار ہوں گے اور پچھتائیں گے ۔ یہ شرابی تصوّف قوم کے لیے موت کا پیغام ہے ۔ یہ آدمی کو سُست، کاہل، بے کار اور نکمّا بناتا ہے ۔ غور تو کرو کہ ایسے صوفی اور ایک چرسی یا بھنگڑی میں کیا

فرق ہے۔

لہٰذا جب اللہ تعالیٰ تمہاری محنتوں کا صلہ اپنے فضل و کرم سے عطا فرمائے، اور روحانی برقی قوت تمہارے قلوب میں پیدا ہو جائے تو اس کے نشہ سے مغلوب مت ہو۔ بلکہ کام میں لگ جاؤ اور پہلے کی نسبت اور زیادہ شوق اور جوش سے عمل کرو، عمل کرو، اور عمل کرتے رہو۔ روحانی نشہ میں بیکار مت پڑے رہو۔ اپنی اصلاح کرو۔ دنیوی ترقی کے لیے راہیں نکالو۔ اور اُن پر عمل کرو۔ خلق خدا کی خدمت کرو۔ اور سب کے ساتھ محبت سے پیش آؤ۔ کتنی ہی تکلیفیں اور مصیبتیں پڑیں مایوس اور اُداس مت ہو۔ ہمت نہ ہارو۔ ہمیشہ خوش رہا کرو۔ دل میں خدا کو بسائے رکھو۔ ہاتھ پاؤں کو خدمتِ خلق میں لگائے رکھو۔ اسی میں کامیابی ہے۔ یہی دائمی مسرّت اور حقیقی زندگی کا راز ہے۔ مرتے دم تک کام کرتے رہو۔ اور خدا کی یاد میں مر جاؤ۔ تمہیں کیا خبر یہ کتنا بڑا کام ہے اور مرنے کے بعد اِس کا کیا انعام ملے گا۔ جنتیں تو ایک گھٹیا سودا ہے۔ ایسی زندگی کا صلہ تو خود خدا ہے۔ باقی باتیں مفصّل طور پر "تعمیر ملّت" اور "طریقت توحیدیہ" میں موجود ہیں۔ اُن کو اتنا پڑھو کہ زبانی یاد ہو جائیں اور اُن پر عمل کر سکو۔

آؤ اب دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی مدد فرمائے۔ ہم کو مرتے دم تک صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔ اپنی اور اپنے حبیب ﷺ کی اور اپنی مخلوق کی محبت عطا فرمائے۔ ہمیں بنی نوع انسان کی خدمت کا جذبہ دے اور ہمارا خاتمہ اسلام پر کرے۔

آمین یا رب العالمین۔

خادم الخدام عبد الحکیم انصاری

نوشہرہ ورکاں

۱۳ر اپریل ۱۹۶۲ء

(۲)

اللہ تبارک تعالےٰ کا شکر کس زبان اور کس مُنہ سے ادا کیا جائے جس نے اپنی عنایاتِ بے پایاں سے ہم کو پھر ایک جگہ اکٹھے ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔

یہ ہمارا پانچواں سالانہ اجتماع ہے۔ اس سے پہلے چار اجتماعات نوشہرہ ورکاں میں ہوئے تھے۔ اس سال خرابیٔ صحت کی وجہ سے ارادہ تھا کہ اجتماع اگلے سال پر ملتوی کر دیا جائے لیکن تمام اہل سلسلہ خصوصاً میاں محمد علی۔ میاں جمیل گل اور خان محمد قاسم صاحب کے پیار بھرے اصرار نے مجبور کر دیا۔ اور یہ اُنہی کے خلوص کا نتیجہ ہے کہ آج ہم سب یہاں موجود ہیں۔ اس لیے میں ان تینوں صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور باقی اہلِ حلقہ کا بھی تہہ دِل سے شکر گزار ہوں کہ وہ دُور دراز مقامات سے سفر کی صعوبتیں اُٹھا کر اللہ اور اس کے رَستہ کی باتیں کرنے اور سننے کے لیے یہاں تشریف لائے۔

مَیں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ ان سب کی مساعیٔ جمیلہ کو بہرہ ور کرے اور ان سب کو دین و دُنیا میں ہر طرح سے کامیاب فرمائے۔ آمین

پچھلے سال کے اجتماع میں تین تجاویز خاص طور پر منظور کی گئی تھیں۔ ایک یہ کہ حلقہ کے ارکان کی تعداد بڑھانے کے لیے ہر شخص (جو اہل ہو) کم از کم ایک نئے آدمی کی اصلاح کر کے حلقہ میں شامل ہونے کے قابل بنائے۔

دُوسری یہ کہ حلقہ کا ہر ایک آدمی نیا ہو یا پُرانا روحانی قوت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اپنے اخلاق کی مزید اصلاح کرے۔ اور اس ضمن میں ان باتوں پر خاص زور دیا گیا تھا کہ آپ لوگ خلقِ خدا کی محبت اور خدمت کے جذبہ کو اور زیادہ ترقی دیں۔ ہمیشہ حق پر چلنے کی کوشش کریں اور قوتِ برداشت کو اور زیادہ بڑھائیں۔

تیسری تجویز یہ تھی کہ توحید یہ سوسائٹی کے لیے جو فنڈ جمع کیا جا رہا ہے اُس کو قائم رکھا جائے اور دو سال میں ہر وہ شخص جو اس کا ممبر بنا ہے کم از کم پانچ سو روپیہ کے حصے اور خریدے۔ لیکن مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان تجاویز پر سلسلہ کے بہت کم لوگوں نے عمل کیا ہے۔ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے یا تو بالکل ہی عمل نہیں کیا یا جو تھوڑا بہت کیا ہے وہ بھی بہت بے دلی کے ساتھ۔ حالانکہ پچھلے سال کے خطبہ میں میں نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ ایسے اجتماعات کا فائدہ صرف انہی لوگوں اور انہی جماعتوں کو ہوتا ہے جو ان اجتماعات میں منظور ہونیوالی تجاویز پر کماحقہٗ عمل کرتے ہیں۔

آج میں آپ لوگوں سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ یا تو سلسلہ کے دستور العمل اور اجتماعات میں منظور ہونے والی تجاویز پر پوری طرح عمل کیا کریں یا پھر مجھے صاف صاف بتا دیں کہ آپ عمل نہیں کر سکتے تاکہ میں ان اجتماعات کو بند کر دوں۔

یاد رکھئے کہ میں باتیں بنانا پسند نہیں کرتا بلکہ عمل چاہتا ہوں۔ غالباً آپ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں سوسائٹی بنانے کے حق میں نہ تھا لیکن حلقہ کے چند عزیز دوستوں نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی سوسائٹی کے قواعد وغیرہ مرتب کر لیے اور غالباً دو چار احباب سے کچھ روپیہ بھی وصول کر لیا۔ اُس کے بعد مجھ سے اجازت مانگی۔

میری یہ عادت ہے کہ میں کبھی بھی کسی کی اُپج اور اُمنگوں کو کچلنا نہیں چاہتا۔ اسی لئے نئی تجاویز اور نئے منصوبوں پر عمل کرنے کی ہمیشہ اجازت دے دیتا ہوں خواہ وہ منصوبے اور تجاویز کامیاب ہوں یا ناکامیاب۔ ناکامیابی سے میں کبھی نہیں ڈرا۔ اگر ہم ناکامیوں کے ڈر سے کوئی نیا کام ہی نہ کریں تو گویا ہم کبھی کچھ کریں گے ہی نہیں۔ ہمارا کوئی قدم بھی آگے نہ بڑھے گا۔ اور ہم پتھر کی طرح ایک ہی جگہ پڑے رہیں گے۔ لیکن آج میں اُن دوستوں سے جنھوں نے سوسائٹی قائم کرنے کی تجویز کی تھی۔ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے سوسائٹی کے

کام کو آگے بڑھانے اور اتمام تک پہنچانے کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ کتنے آدمیوں سے بات چیت کی ہے۔ کتنا لٹریچر چھپوایا ہے۔ کہاں کہاں کے دورے کیے ہیں خود کتنا روپیہ دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور اگر آپ نے کچھ بھی نہیں کیا سارا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال کر بے فکر ہو گئے ہیں تو خود سوچئے کہ آپ کا یہ رویّہ کہاں تک حق بجانب ہے۔ آپ اپنے لیے کونسا نام پسند کرتے ہیں۔ میں تو ایسے آدمیوں کو شیخ چلّی کہا کرتا ہوں۔

یہ جو کچھ میں نے بیان کیا یہ تو تھا ہی قابلِ افسوس لیکن سب سے زیادہ افسوس تو اِس بات کا ہے کہ بیسیوں اور سینکڑوں مرتبہ بتانے کے باوجود ارکان حلقہ کی اکثریت اب تک یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ ہمارا یہ نیا سلسلہ کیوں قائم کیا گیا ہے اور ہمارے سلسلہ اور دوسرے سلسلوں میں کیا فرق ہے۔ یہ بات چوں کہ میں ہر ایک آدمی کو بار بار نہیں بتا سکتا اس لیے طریقت توحیدیہ میں کافی وضاحت کے ساتھ لکھ دی ہے۔ لیکن آپ لوگ تو اس چھوٹی سی کتاب کو غور سے پڑھنے اور اس میں دیئے ہوئے خاص خاص اصولوں کو یاد رکھنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے عمل کرنے اور اپنے کردار کو اُن اصولوں کے مطابق ڈھال لینے کا تو ذکر ہی بے فائدہ ہے۔

میرے خیال میں تو اتنی بات سبھی جانتے ہیں کہ انسان کی تمام شرافت اور ساری بڑائی صرف اِس اصول پر منحصر ہے کہ وہ جن باتوں کو خود اپنی مرضی اور خوشی سے اپنے اُوپر لازم کرلے اُن پر دِل و جان سے عمل کرے۔ اور کتنی ہی رکاوٹیں راہ میں حائل کیوں نہ ہوں سب کو ٹھکراتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے۔ جو فرد یا جماعت ایسا نہیں کرتی وہ کبھی اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آج کے خطبہ میں میری سب سے بڑی نصیحت آپ کو یہی ہے کہ آپ عمل کرنے کی عادت ڈالیں اور یاد رکھیں کہ عمل زندگی ہے اور بے عملی موت!

اب میں ایک مرتبہ پھر یہ بتاتا ہوں کہ ہم نے سلسلۂ توحیدیہ کیوں قائم کیا ہے۔ پچھلے سال کے خطبہ میں میں نے بیان کیا تھا کہ ایک اچھے اور سچے مرشد کی تلاش میں دس سال

تک ہر قسم کے فقیروں کے پاس گیا اور ہر رنگ اور ہر سلسلہ کے بزرگوں سے ملا حتیٰ کہ حضرت مولانا کریم الدین احمدؒ سے نقشبندیہ سلسلہ میں بیعت ہو گیا۔ بیعت ہونے کے بعد جب تک نقشبندیہ سلوک طے نہ کر لیا میں اور کسی بزرگ سے قطعاً نہیں ملا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے سالک میں اپنے سلسلہ اور شیخ کا خالص رنگ پیدا نہیں ہوتا، دورنگی آجاتی ہے۔ اور یہ بہت بڑا نقص ہے۔ تکمیل سلوک کے کچھ عرصہ بعد میں نے پھر فقرا سے ملنا شروع کیا اور بیس بائیس سال تک ہر رنگ اور ہر سلسلہ کے بزرگوں سے ملتا رہا۔ لیکن پہلے زمانہ کے ملنے اور اب تکمیل سلوک کے بعد کے ملنے میں بڑا فرق تھا۔ پہلے تو میں عقیدت اور طلب کے جذبہ سے ملتا تھا اور اب جس سے ملتا اُس کو تنقیدی اور تحقیقی نظر سے دیکھتا تھا۔

آپ کو سوال کرنا چاہیئے کہ اب میں ان لوگوں سے کیوں ملتا تھا۔ اور ان ملاقاتوں سے میں نے کیا تجربہ اور علم حاصل کیا۔ میں بتاؤں۔ دراصل مجھ کو بچپن ہی سے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ دُنیا میں آنکھیں کھول کر زندگی بسر کرو۔ اپنے گرد و پیش اور ماحول کے حالات سے پوری طرح باخبر رہو۔ مجھے اس بات کی پوری تربیت بھی دی گئی تھی اور اب یہ بات میری عادت بن گئی تھی۔ چنانچہ جوں جوں علم و مشاہدہ بڑھتا گیا۔ دل و دماغ میں یہ احساس بھی شدت اختیار کرتا گیا کہ مسلمان جو کبھی اس زمین پر اللہ کے وارث اور خلیفہ یعنی نائب تھے آج اس قدر پسماندہ، کمزور اور ذلیل کیوں ہو گئے ہیں کہ دُنیا کی ہر ایک قوم اُن کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس احساس کیساتھ قدرتی طور پر مجھے مسلمانوں کے اسباب زوال کی جستجو شروع ہوئی اور اس موضوع پر جتنی بھی کتابیں اور مضامین مل سکے سب کا مطالعہ کیا اور مسلمانوں کے مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی حالات کو بہ نظر غائر دیکھا۔ اور اُن کے اخلاق و عمل کا موازنہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں اور اُن اقوام کے ساتھ کیا جو آج تہذیب و تمدن کی اجارہ دار خیال کی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں میں ترقی کی جو تحریکیں وجود میں

آئیں اُن کے متعلق بھی بحدّ امکان پوری معلومات حاصل کیں۔ مثلاً جمال الدین افغانی رح کی تحریکِ اتحاد المسلمین۔ سیّد احمد بریلوی رح کی تحریکِ جہاد۔ ترکی کی تحریکِ اتحاد و ترقی۔ سیّد احمد خاں رح کی تحریکِ احیاء العلوم۔ علامہ مشرقی کی تحریکِ خاکساراں اور ہندوستانی مسلمانوں کی تحریکِ خلافت۔ پھر ان تمام تحریکوں کی ناکامیابی کے نفسیاتی اور مادّی اسباب پر برسوں غور کیا۔ اس کے علاوہ اچھے ہوشمند علماء اور باخبر لوگوں سے تبادلۂ خیالات بھی کرتا رہا۔ اور آخرکار اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہمارے زوال کے ذمّہ دار ہمارے تین طبقات ہیں:

اوّل بادشاہ اور امراء، دُوسرے علمأ اور تیسرے صوفیا۔ چونکہ عوام سارے کے سارے ہر وقت اِن تینوں طبقات سے متاثر ہوتے ہیں اور انہی کی ریس اور پیروی کرتے ہیں۔ اس لیے جب اِن تینوں طبقات میں خرابیاں پیدا ہوئیں تو ساری قوم خراب ہو گئی۔ ان طبقات میں یہ خرابیاں کس طرح پیدا ہوئیں اور کس طرح دُوسروں پر اثر انداز ہوئیں اس کی مکمل تاریخ لکھنے کے لیے تو ہزار ہا صفحات اور بڑا وقت درکار ہے۔

اِس خطبہ میں نہ یہ سب کچھ بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ اِس کا موقع و محل ہے: تاہم اس قدر بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس خرابی نے سب سے پہلے بادشاہوں اور امیروں کے گھر میں جنم لیا اور اُس کی ابتداء شاہانِ بنی اُمیّہ کے زمانہ ہی میں ہو گئی تھی، بنو عباس کے زمانہ میں یہ خرابی اور زیادہ ہو گئی اس کی وجہ دولت کی زیادتی، حکومت کا نشہ، سامانِ عیش و عشرت کی افراط، اور رفتہ رفتہ قرآن اور سنّت سے دوری و مہجوری تھی۔ امراء سے یہ وبا علماء کے طبقہ میں پہنچی۔ اکثر بادشاہ اور امراء اپنی سیاسی اور معاشرتی ناجائز اغراض کو پورا کرنے کے لیے علماء سے فتوے لیتے تھے جو عالم انکار کر دیتا اس پر عتاب نازل ہوتا اور جو مرضی کے مطابق فتویٰ دے دیتا اُس کو مال و زر اور اعزاز و مناصب سے نوازا جاتا۔

نتیجہ یہ ہُوا کہ علماء میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جو علماءِ سوء کے نام سے مشہور ہے۔

شاہانِ بنو عباس کے زمانہ میں یونان کا فلسفہ اور دوسرے علوم عربی میں ترجمہ کیے گئے جس کی وجہ سے فرقۂ معتزلہ وجود میں آیا اور قرآنی آیات اور تنقادِ دینی کی نئی نئی تاویلات ہونے لگیں اور نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے مثلاً کلام حادث ہے یا قدیم۔ اللہ تعالےٰ جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔

اِن مسائل میں جو علماء بادشاہ وقت کے عقیدے کے خلاف ہوتے اُن کو ایذا اور سزائیں دی جاتیں اور جو متفق ہوتے اُن کو انعام و اکرام سے مالامال کر دیا جاتا۔ اس طرح رفتہ رفتہ علمائے حق کم اور علمائے سوء زیادہ ہوتے گئے اور ہمارے زمانہ میں تو اُن کے درمیان امتیاز کرنا بھی مشکل ہو گیا۔

حضور اکرمؐ کی ایک حدیث بیہقیؒ نے شعب الایمان میں حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ "فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ قریب ہی لوگوں پر ایسا وقت آئے گا جب اسلام میں سے صرف اس کا نام باقی رہ جائے گا اور نہیں رہے گا قرآن میں سے مگر اس کے نقوش۔ اُن کی مسجدیں (بظاہر) آباد لیکن حقیقت میں خراب ہوں گی۔ ہدایت سے اُن کے علماء آسمان کے نیچے کی تمام مخلوق میں سب سے بدتر ہوں گے۔ اُنہی سے دین میں فتنہ پیدا ہوگا اور اُنہی میں لوٹ آئے گا۔" ملاحظہ فرمایا آپ نے بیہقی رحمتہ اللہ علیہ تو شاید اپنے ہی زمانہ کو اس حدیث کا مصداق خیال کرتے ہوں۔ لیکن اگر ہمارے زمانہ پر بھی یہ صادق نہیں آتی تو پھر شاید وہ زمانہ کبھی نہ آئے۔

یہ تو تھا ہمارے امراء اور علماء کا حال۔ صوفیاء کا حال اس سے بھی بدتر ہے۔ وہ تصوّف جس کی تعلیم حضور سرورِ کائنات نے دی تھی مشکل سے ڈیڑھ دو سو برس قائم رہا۔ جیسا کہ تاریخ تصوّف کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے لیکن دوسری صدی ہجری کے آخری ربع سے اس میں طرح طرح کی بدعتیں شامل ہونے لگیں اور اس آبِ حیات کا وہ چشمہ صافی جو انسانی روح کو قرار واقعی زندگی بخشتا ہے گدلا ہونے لگا اور جوں جوں زمانہ

گذرتا گیا مکدر سے مکدر تر ہوتا چلا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسی کوئی تعلیم دے ہی نہیں سکتے تھے جو قرآن کے خلاف ہو اور قرآن نے ہم کو دو باتیں بتائی ہیں ایک یہ کہ ماننے اور پوجنے کے لائق صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔ وہی تمام کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ وہی پیدا کرتا اور مارتا ہے۔ وہی مرنے کے بعد ہمارے اعمال کی جزا و سزا دے گا اور وہی ہم کو پھر قبروں سے زندہ کر کے نکالے گا۔ وہی تقدیریں بناتا اور بگاڑتا ہے۔ وہ ہر لحاظ سے یکتا اور بے مثال ہے۔ نہ اُس کا کوئی ثانی ہے نہ شریک۔ یہی وہ توحید ہے جو قرآن سکھاتا ہے۔

اب اگر کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا عالم اور صوفی مانا جاتا ہو اگر ہم کو اس توحید کے خلاف کچھ بتائے تو کیا ہمیں اُس کی بات مان لینی چاہیے۔؟

دُوسری بات قرآن نے یہ بتائی ہے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے۔ کہنے کو تو یہ دو لفظ ہیں لیکن یہی دو لفظ انسان کے تمام اعمال و افعال پر حاوی ہیں۔ ان دونوں لفظوں کی تفصیل بھی قرآن نے بتائی ہے اور خیر پر چلنے اور شر سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ یہی وہ قانون ہے جس پر عمل کرنے سے انسان اِس دُنیا میں امن و سکون۔ راحت و آرام اور خوشی و مسرت کی زندگی بسر کر کے ترقی کرتا چلا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں تکوین و ایجاد کی اُس کو عطا کی ہیں اُن کو کام میں لا کر زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے اُس کو تسخیر کرنے کا اہل بن جاتا ہے۔

اب آپ یہ بتائیں کہ اگر کوئی صوفی ہم کو یہ تعلیم دے کہ اللہ ہم سے الگ اور کوئی ہستی نہیں ہے۔ ہم خود ہی خدا ہیں۔ یا دُنیا کی ہر شے خدا ہے۔ یا شر اور خیر سب ڈھونگ ہے نہ گناہ کوئی چیز ہے نہ نیکی کوئی شے ہے نہ عبادت کی

ضرورت ہے۔ یا یہ کہے کہ یہ دُنیا محض خواب و خیال ہے اس میں ترقی و عظمت حاصل کرنے کا خیال کرنا بھی گناہ ہے۔ اس کے لیے نہ کسی کوشش و سعی کی ضرورت ہے نہ محنت و مشقت کی۔ ان سب کو چھوڑ کر گوشۂ تنہائی میں بیٹھ جاؤ۔ خدا پر توکل کرو وہ تمہارا رزق خود ہی تمہارے پاس بھیج دے گا تو آپ ہی فرمائیں کہ اُس کا یہ کہنا کہاں تک قرآن کی تعلیم کے مطابق ہے۔

اب حقیقت یہ ہے کہ پچھلے ہزار سال سے صوفیوں کی ایک بڑی جماعت یہی تعلیم دے رہی ہے، اب مصیبت یہ ہے کہ عوام امیروں بلکہ علماء سے بھی کہیں زیادہ صوفیوں کو مانتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے ولی اور اُس کے مقرّب بندے ہیں خدا اُن سے باتیں کرتا ہے وہ جو کچھ کہتے ہیں خدا کی زبان سے کہتے ہیں اس لیے ان کا کہا کس طرح غلط ہو سکتا ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ اکثر صوفیوں سے کشف و کرامات سرزد ہوتی دیکھتے ہیں تو اُن کا عقیدہ ان صوفیاء پر اور بھی پختہ ہو جاتا ہے اس لیے کوئی لاکھ سر پٹکے وہ تو انہی کی بات کو سچ جانتے ہیں۔ اور انہی کے کہنے کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک ہزار برس سے ہو رہا ہے اور یہ اُسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری قوم بدعقیدگی اور بداعمالی کے اُس درجہ تک گر چکی ہے جہاں سے اُس کو اُٹھانا ناممکن نہیں تو بے انتہا دشوار ضرور ہے۔

قصہ مختصر مدت دراز تک امراء، علماء اور صوفیاء کے اعمال و کردار کی تحقیق کرتے اور عمر کا ایک بڑا حصہ اس میں صرف کر دینے کے بعد میرا یہ خیال یقین کے درجہ تک پہنچ گیا کہ قوم کی گراوٹ اور تباہی کے ذمہ دار یہی تین طبقے ہیں۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان تینوں طبقوں میں اچھا آدمی کوئی ہے ہی نہیں، بلا استثنیٰ سبھی بُرے ہیں۔ اچھے لوگ بھی بہت ہیں لیکن اُن کی تعداد آٹے میں نمک کی برابر ہی ہے۔

امرا میں تین قسم کے آدمی ہیں :

۱ - نواب اور زمیندار وغیرہ -

۲ - بڑے بڑے تاجر اور سرمایہ دار - ۳ - افسران حکومت -

ان تینوں جماعتوں میں ذاتی اور شخصی عیوب کے علاوہ ایک عیب ایسا ہے جس کا اثر عوام پر بہت زیادہ پڑتا ہے اور وہ ہے عوام کے ساتھ ان کا تحقیر آمیز سلوک، عیاشی اور اوباشی کے عیب کسی میں بھی ہوں اس قدر رازداری اور پردے میں رکیے جاتے ہیں کہ عوام کو معلوم نہیں ہوتا سوائے اُن چند افراد کے جو ان کی ہوس رانیوں کا آلہ کار بنتے ہیں اس لیے ایسے ذاتی و شخصی عیوب کا اثر عام نہیں ہوتا لیکن ویسے دن رات کی پبلک زندگی اور کاروبار میں چونکہ عوام کا واسطہ چوبیس گھنٹے انکے ساتھ پڑتا ہے اسلیے وہ انکے طریقہ سلوک سے بہت زیادہ اثر پذیر ہوتے ہیں - یہ جب اپنے ملازموں - کارندوں - اہل کاروں - ماتحتوں یا اہل معاملہ سے ملتے ہیں تو اس وقت ان کی حرکات و سکنات اور انداز تخاطب میں اس قدر رعونت و خشونت اور سختی و درشتی ہوتی ہے کہ ملنے والے اپنے آپ کو سخت ذلیل و حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور چونکہ دن رات ہر جگہ اور ہمیشہ یہی کچھ پیش آتا ہے اس لیے رفتہ رفتہ احساس کمتری اور قنوطیت ان میں اس درجہ سرایت کر جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو واقعی حقیر و ذلیل، بیکس و بےبس اور بےچارہ و ناکارہ خیال کرنے لگتے ہیں - ڈر، خوف اور بےحوصلگی اُن کی طبیعت ثانی بن جاتی ہے - احساس خودی و خودداری، خود اعتمادی اور ذاتی تعزز کا ان میں نام و نشان بھی نہیں رہتا اور رفتہ رفتہ دوسری اخلاقی خوبیاں بھی فنا ہو جاتی ہیں - جس قوم کی بھاری اکثریت ایسے آدمیوں پر مشتمل ہو وہ قوم بھلا کیا کام کر سکتی ہے اور دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے ساتھ کس طرح دوش بدوش چل سکتی ہے - سچی بات تو یہ ہے کہ بڑے بڑے زمیندار اور تاجر اگرچہ اپنے

ملازموں وغیرہ کے ساتھ انسانیت کا برتاؤ نہیں کرتے لیکن اہلِ معاملہ کے ساتھ خاصی خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں یہ دُوسری بات ہے کہ یہ خوش خُلقی قطعاً بناوٹی اور محض کسبِ زر اور جلبِ منفعت کے لیے ہوتی ہے۔ لیکن افسرانِ حکومت تو اہلِ معاملہ کے ساتھ بھی اُسی خشونت و رعونت سے ملتے ہیں جیسے کہ اپنے نجی ملازموں یا ماتحتوں سے۔ الغرض! اِن لوگوں کی وجہ سے بھی عوام میں اپنی کمتری اور ذلت کا احساس اُسی طرح پیدا ہوتا ہے جیسے کہ رئیسوں اور تاجروں کے سلوک سے ہوتا ہے۔

دُوسرا طبقہ علماء کا ہے۔ اِن کا سلوک بھی عوام کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہے جیسا کہ امرا کا۔ یہ بھی غریبوں سے اسی رعونت اور خشونت سے پیش آتے ہیں جیسے کہ امراء اور افسر۔ امراء اور افسروں کو اپنی دولت اور حکومت کا زعم ہوتا ہے۔ علماء کو اپنے تقویٰ اور علم کا غرور ہوتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو جنّتی اور دُوسروں کو دوزخی جانتے اور اُن سے سیدھے مُنہ بات کرنے میں بھی شاید اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اگر ایک غریب آدمی اِن کے پاس کوئی مسئلہ پوچھنے جائے اور مولانا کی بات سے اُس کی تسلّی نہ ہو اور وہ کوئی جرح کر دے تو سمجھ لو کہ اُس کی شامت آ گئی۔ وہ صلواتیں سننی پڑتی ہیں کہ خدا کی پناہ، اگر کوئی ایسا شخص جس کی ڈاڑھی منڈی یا کتری ہوئی ہو۔ لبیں بڑھی ہوئی ہوں۔ یا پائجامہ ٹخنوں سے نیچا ہو اِن کی خدمت میں حاضر ہو تو اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیتے ہیں اور اُس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ میں یہ باتیں کہاں تک گناؤں۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ الطاف حسین حالی نے جو کچھ مسدّسِ حالی میں ان کی بابت تحریر فرمایا ہے وہی لکھ دوں۔ وَھُوَ ھٰذا ؎

بڑھے جس سے نفرت وہ تقریر کرنی | جگر جس سے شق ہوں وہ تحریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی | مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ | یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ
کوئی مسئلہ پوچھنے اُن سے جائے | تو گردن پہ بارِ گراں لے کے آئے

اگر بد نصیبی سے شک اس میں لائے — تو قطعی خطاب اہلِ دوزخ کا پائے
اگر اعتراض اُس کی نکلا زباں سے — تو آنا سلامت ہے دشوار واں سے
کبھی وہ گلے کی رگیں ہیں پھلاتے — کبھی جھاگ پر جھاگ ہیں منہ پہ لاتے
کبھی خوک اور سگ ہیں اسکو بتاتے — کبھی مارنے کو عصا ہیں اُٹھاتے
ستون چشم بد دور ہیں آپ دیں کے — نمونہ ہیں خُلقِ رسُولؐ امیں کے

الغرض یہ ہے سچّی تصویر ہمارے علمائے سُو کی میری نظر سے ایک دو نہیں سینکڑوں واقعات ہُو بہُو ایسے ہی گزرے ہیں۔ آج سے کوئی بیس بائیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ ایک دِن میں عصر کی نماز پڑھنے دہلی کی ایک اچھی بڑی اور معروف مسجد میں گیا۔ جماعت ہو چکی تھی اس لیے مَیں نے اپنی نماز اکیلے ہی پڑھی۔ نماز پڑھنے کے بعد میں کچھ وظیفہ پڑھ رہا تھا کہ یہ آواز کان میں آئی:

"تم سے کہا کس مردود نے تھا کہ اپنے لڑکے کو انگریزی پڑھاؤ۔ اب مجھے کیا کہتے ہو جاؤ دفعہ ہو جاؤ۔" یہ بات سُن کر میں نے سر موڑا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مسجد کے پیش امام صاحب ایک آدمی سے مخاطب ہیں۔ وہ غریب مولانا کی بات سُن کر بہت حیران ہُوا اور کہنے لگا "کیا انگریزی پڑھنا گناہ ہے"۔ مولانا تو یہ سُن کر آگ بگولا ہو گئے۔ فرمانے لگے "گناہ کا بچہ۔ ابے یہ تو کفر ہے کفر۔ یہ جتنی بے دینی پھیل رہی ہے سب انگریزی ہی کی وجہ سے ہے۔ چلو یہاں سے دفان ہو"۔ یہ کہہ کر مولانا نے اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا اور وہ بے چارہ جُوتے اٹھا کر چل دیا۔ میں بھی اُس کے ساتھ ہی اُٹھا۔ مسجد سے باہر آ کر مَیں نے اُس سے پوچھا کہ "کیا معاملہ تھا"۔ کہنے لگا "جی کیا بتاؤں۔ میرا لڑکا میٹرک کے امتحان میں فیل ہو گیا ہے اور اس وجہ سے اتنا رنجیدہ ہے کہ کوئی کام ہی نہیں کرتا۔ پڑھنا لکھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا تھا کہ کوئی

تعویذ دے دیں تاکہ اُس کا دِل پڑھائی میں لگنے لگے تو وہ کہتے ہیں انگریزی پڑھنا ہی کفر ہے۔" وہ تو یہ کہہ کر ایک طرف چلا گیا اور میں کچھ سوچتا ہُوا اپنے گھر چلا آیا۔ یہ ایک واقعہ ہے اُن سینکڑوں واقعات میں سے جو خود میں نے دیکھے ہیں۔

قرآن تو کہتا ہے کہ "اللہ کے راستہ کی طرف حکمت اور پیاری پیاری نصیحت کے ساتھ لوگوں کو بلاؤ۔" لیکن ہمارے علماء کا طریقۂ نصیحت تو ایسا کڑوا ہے کہ جس کو ایک مرتبہ واسطہ پڑ جائے وہ پھر دوبارہ اُن کے پاس جانے کا نام بھی نہیں لیتا۔ اس سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔ اصلاح تو ہوتی نہیں، دین سے نفرت ہو جاتی ہے۔ خصوصاً انگریزی تعلیم یافتہ تو اِن مولویوں کی بداخلاقی کو دیکھ کر بالکل ہی بے دین ہو جاتے ہیں۔ وہ دین سے تو واقف ہوتے نہیں۔ اِن علماء ہی کو دیکھ کر دینی تعلیم کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اور یہ باور کر لیتے ہیں کہ دینِ اسلام میں غصّہ، نفرت اور سختی و درشتی کے سوا ہے ہی کچھ نہیں۔ ان میں سے کتنے ہی تو عیسائی ہو جاتے ہیں۔ اور محض اس واسطے ہو جاتے ہیں کہ عیسائی خود اور اُن کے پادری بہت اچھے اخلاق کے ساتھ اُن سے ملتے ہیں اور اکثر مصیبتوں میں اُن کی مدد بھی کرتے ہیں۔

علماء کا کام صرف یہی تو نہیں کہ مسجد میں نماز پڑھا دی۔ جمعہ کے دِن خطبہ سُنا دیا۔ مدرسہ میں درس دے دیا یا مسئلے مسائل سمجھا دئے وہ تو نائبِ رسولؐ ہیں۔ اِس لیے اُن کا فرض تو یہ ہے کہ قوم کا اخلاق رسولؐ کے معیار پر قائم رکھیں۔ قوم کے افراد میں اتحاد اور محبّت و اخوّت پیدا کریں۔ تاکہ قومی قوّت اور طاقت میں کمی نہ آنے پائے اور قوم دِن بدن مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے۔ مگر یہاں تمام باتیں اُلٹی ہیں۔ اخلاق وہ سدھار سکتا ہے جس کا اخلاق خود اچھا ہو اور اِن کے اخلاق کا نمونہ ابھی بیان ہُوا۔ اسی طرح محبّت و اخوّت صرف وہ لوگ

پیدا کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں خود محبت اور اخوت کے جذبات موجزن ہوں۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ قوم میں ارتباط پیدا کرنے کی بجائے اس کے ٹکڑے کیے جا رہے ہیں۔ کتنے ہی فرقے ہیں اور ہر فرقہ کے علماء اپنے آپ کو ناجی اور دوسروں کو گمراہ سمجھتے ہیں۔ پرائیویٹ بات چیت ہو یا کسی انجمن میں گفتگو۔ پبلک جلسوں میں تقریریں ہوں یا مساجد کے منبروں سے جمعہ کے خطبے ہر جگہ ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا ان کا شیوہ ہے۔ اخلاق پر کسی کو تقریر کرتے آپ نے سنا ہے۔ محبت و اخوت اور رابطہ و اتحاد کی تحریک کسی عالم نے کبھی پیش کی ہے۔ عوام ان کی حرکات کو دیکھ دیکھ کر خود بھی اسی رنگ میں رنگ گئے ہیں۔

الغرض! کہاں تک بیان کروں۔ میں جو کچھ بیان کر رہا ہوں یہ بھی برائی ہے اور برائی خواہ کیسے ہی حالات میں کی جائے آخر برائی ہے۔ میرا دل ایسی باتیں کرنے سے بہت دکھتا ہے۔ لیکن انتباہ اور آگاہی کے لیے کہنا ہی پڑتا ہے۔ نیت بخیر ہو تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے۔ نہ بتاؤ اور نہ ظاہر کرو تو بھی شاید اللہ تعالیٰ باز پرس کر بیٹھے کہ جب تو جانتا تھا تو بتایا کیوں نہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ میرا سچا دوست وہ ہے جو میری برائیوں کا تحفہ لے کر میرے پاس آتا ہے۔ رسول اکرمؐ کی حدیث ان علماء سُو کے بارے میں ابھی بیان کی جا چکی ہے ایک بار اس کو پھر دیکھ لیں۔

مشہور انگریز فلاسفر فرانسس بیکن کہتا ہے کہ "مذہبی فرقے اگر زیادہ ہو جائیں تو اس سے قوم میں الحاد پیدا ہوتا ہے۔" اس کا یہ کہنا بالکل درست اور بجا ہے مسلمانوں میں دین سے تغافل اور بے پروائی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے ہاں بھی بہت سے فرقے پیدا ہو گئے ہیں۔ ہر فرقہ کے علماء اور مقلد دوسرے فرقے کو گمراہ بتاتے اور قرآن و حدیث سے ثابت کرتے ہیں تو سننے والوں کے دلوں میں

نادانستہ طور پر یہ بات جم جاتی ہے کہ یہ سبھی جھوٹے اور غلط راستے پر گامزن ہیں یا یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمارے مذہب کی تعلیم میں ہی اس قدر متضاد باتیں موجود ہیں کہ ہر فرقہ اپنی سچائی اور دوسروں کے بطلان کا ثبوت ایک ہی کتاب سے پیش کر سکتا ہے۔ اس لیے سارا مذہب ہی گویا بازی گر کا پٹارہ ہے کہ اُس میں سے جو چاہو نکال کر دکھا دو۔ انگریزی تعلیم یافتہ لوگ اس فرقہ بندی سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور مذہب سے بیزار ہو جاتے ہیں۔

الغرض علماء کی صحبت میں بیٹھنے، پرائیویٹ اور پبلک جلسوں میں اُن کی باتیں سننے اور اُن کی نجی اور پبلک زندگی کا دُور و نزدیک سے گہرا مطالعہ کرنے کے بعد میں یہی رائے قائم کرنے پر مجبور ہوا کہ ہمارے درد کا علاج ان کے پاس بھی نہیں ہے۔ یہ تو بنانے کی بجائے اور بگاڑ رہے ہیں۔ تعمیر کی بجائے تخریب میں مصروف ہیں۔

اب تھوڑا سا حال صوفیائے کرام کا بھی سن لیں۔ ان کا علم تو مجھے اُمراء اور علماء سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ جیسا میں پچھلے سال کے خطبے میں بیان کر چکا ہوں میں نے اپنی تمام عمر ہی کسب تصوّف میں بسر کی ہے۔ اور اس کے ہر شعبہ اور ہر رنگ سے خوب واقف ہوں۔ لیکن صوفیوں کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے یہ بتا دینا بہت ضروری ہے کہ تصوّف کیا ہے۔ اس کا موضوع و مقصد کیا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے اور جب آدمی کامل صوفی بن جاتا ہے تو پھر اُس کا کام کیا ہوتا ہے۔

اب مختصر طور پر سنئے کہ تصوّف ایک علم ہے جس کا موضوع ہے اُن طاقتوں اور ہستیوں کی حقیقت معلوم کرنا جن پر ہمارے مذہب کی بنیاد قائم ہے اور جن کو بغیر دیکھے اور بغیر ثبوت کے ماننا ہمارا پہلا فرض ہے اور انہی کے ماں لینے کو ایمان بالغیب کہتے ہیں۔ وہ طاقتیں اور ہستیاں ہیں۔ اللہ۔ فرشتے

الہامی کتب ۔ رسول جن پر یہ کتابیں نازل ہوئی ہیں ۔قیامت کا دِن اور حیات بعدالموت اور جزا اور سزا کے سلسلہ میں جنّت اور دوزخ ۔ ان تمام میں سے انسان صرف الہامی کتب اور رسولوں کو دیکھ سکتا ہے لیکن وہ فرشتہ جو یہ الہام لے کر اللہ کی طرف سے آتا ہے نہیں دکھائی دیتا۔

اب تصوّف کا موضوع صرف یہ ہے کہ اِن چیزوں کا علم اور حقیقت معلوم کرے کہ اللہ کیا ہے، کیسا ہے۔ مخلوق سے اُس کا کیا تعلق ہے۔ قرآن میں وہ اپنے لیے ہاتھ ۔ آنکھ ۔ کان اور نفس رُوح وغیرہ کا ہونا بیان کرتا ہے تو اِس کا کیا مطلب ہے۔ وہ ہاتھ ۔ آنکھ ۔ کان اور نفس روح وغیرہ کیسے ہیں۔ کیا وہ ایسے ہی ہیں جیسے کہ ہمارے یا اور کسی طرح کے ۔ کیا اللہ کی شکل اور جسم انسان ہی جیسا ہے ۔ جیسا کہ ایک حدیث شریف میں بیان ہُوا ہے اور اگر اُس کی شکل وصورت اور جسم انسان جیسا ہی ہے تو پھر وہ ہر جگہ حاضر وناظر کِس طرح ہوسکتا ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ اسی طرح تصوّف یہ بتاتا ہے کہ فرشتے کیسے ہوتے ہیں ۔ وحی یا الہام کیونکر ہوتا ہے ۔ دوزخ وجنّت کی حقیقت کیا اور وہ کہاں ہیں۔ کیا آدمی جیتے جی اُن کو دیکھ سکتا ہے یا صرف اُن کا علم حاصل ہوتا ہے۔ پھر اِن چیزوں کے علم ومعرفت کے حصول کے لیے یہ جاننا بھی تصوّف ہی کے دائرے میں ہے کہ کائنات کیا ہے ۔ مادّہ کیا چیز ہے ۔ روح ونفس کیا ہیں عقل وجذبات کی حقیقت کیا ہے ۔ انسان کیا ہے، کہاں سے آتا ہے کہاں چلا جاتا ہے ۔ پیدا ہونے سے پہلے یہ کیا تھا مرنے کے بعد کیا بن جائے گا وغیرہ وغیرہ ۔

اب رہی دُوسری بات کہ ہم کو اِن باتوں کا علم حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے : تو وہ چند باتیں ہیں ۔ یعنی اوّل تو انسان کو اپنی زندگی ظاہری اور باطنی دونوں طرح پاکیزہ بنانی پڑتی ہے ۔ پھر اُس کو اپنے اخلاق کا تزکیہ

کرنا پڑتا ہے۔ یعنی یہ کوشش کرنی پڑتی ہے کہ جتنی اخلاقی برائیاں ہیں وہ سب دُور ہوں اور جتنی خوبیاں ہیں وہ سب پیدا ہو جائیں۔ اس کے لیے کچھ ریاضت اور مجاہدہ بھی کرنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اُس کو شریعت کی پوری پابندی کرنی اور ہر لحاظ سے رسول کریمؐ کے نقش قدم پر چلنا پڑتا ہے۔ مدت دراز تک ایسا کرنے کے بعد آہستہ آہستہ بزرگی اور بڑائی پیدا ہوتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ انسان کامل ہو جاتا ہے۔ جو لوگ تھوڑی محنت اور تھوڑا عمل کرتے ہیں اُن کو تھوڑا سا حصّہ مل جاتا ہے اور جو زیادہ کرتے ہیں اُن کو زیادہ۔ بدنصیب اور بیوقوف ہیں وہ لوگ جو کچھ بھی نہیں کرتے اور اپنے مرشد کے سر رہتے ہیں کہ ایک نظر میں کامل بنا دو۔

اب سوال یہ ہے کہ جب انسان کامل بن جاتا ہے تو پھر اُس کا کام کیا ہوتا ہے۔ اُس کا کام بھی یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کی اصلاح کرے۔ اُن کو اللہ کا سیدھا راستہ بتائے۔ اخلاق سکھائے۔ لوگوں سے بُرائیاں اور گناہوں کی عادت چھڑائے اور نیک بنائے۔ اور اگر کوئی اس سے زیادہ چاہتا ہے تو اُس کو تصوّف سکھائے اور اپنی طرح سے بزرگ بنائے۔ اس پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب علماء اور صوفیاء دونوں ہی کا کام اصلاح اور اخلاق کی درستی ہے تو عالم بن جانا ہی کافی ہے اس قدر پاپڑ بیلنے اور ریاضت اور مجاہدہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے تو جواب یہ ہے کہ علماء صاحب قال ہوتے ہیں اور صوفی صاحب حال علماء کے کہنے کا دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن صوفی اگر واقعی کامل ہو تو اس کے کہنے کا اثر بہت جلدی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں صوفی کے دل میں ایک طاقت ہوتی ہے وہ اس طاقت کو جس کے دل پر ڈال کر قوت ارادی سے کام لیتا ہے اُس کی کیفیات کو رفتہ رفتہ بدل سکتا ہے۔ اور اُس کے دل پر جو زنگ ہوتا ہے

اُس کو آہستہ آہستہ دُور کر دیتا ہے۔ اس طرح انسان رفتہ رفتہ بد سے نیک اور شقی سے سعید بن جاتا ہے۔

اب اس سے زیادہ اچھا کام اور کیا ہو سکتا ہے کہ مُعاشرہ کو بُرے آدمیوں اور بُرائیوں سے پاک کر کے اس میں نیک آدمیوں اور نیک کاموں کا اضافہ کیا جائے۔ انبیاء کا کام بھی یہی تھا اور جو بزرگ یہ کام کرتے ہیں صحیح معنوں میں وہی انبیاء کے وارث اور نائب کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس کے علاوہ ان بزرگوں کا کام تبلیغِ اسلام ہے۔ آج اقصائے عالم میں جو مُسلمان نظر آتے ہیں اور جو تعداد میں پچاس ساٹھ کروڑ سے کسی طرح کم نہیں ہیں وہ انہیں بزرگوں کی محنت کا ثمر ہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام مسلمان بادشاہوں کے زورِ بازو سے پھیلا ہے وہ بتائیں کہ انڈونیشیا، چین وغیرہ میں جو کروڑوں مُسلمان آباد ہیں وہاں کونسے بادشاہ فوجیں لے کر گئے تھے۔ ہندوستان میں بھی سلطنت اسلامیہ قائم ہونے سے پہلے لاکھوں آدمی مسلمان ہو چکے تھے اور یہ بھی مُسلمان صوفیوں کی محنت و تبلیغ ہی سے مُسلمان ہوئے تھے۔ اِن بزرگوں میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ذات بابرکات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ آج کل دُوسرے مذاہب کے لوگوں کو مُسلمان بنانے کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ خود مُسلمانوں کی اصلاح کرنے کی۔ لیکن آپ غور فرمائیں تو یہ کام مطلق نہیں ہو رہا ہے۔

الغرض! یہ ہیں وہ کام جو تصوّف میں کامل ہونے کے بعد صوفیاء پر لازم اور فرض ہو جاتے ہیں۔

جو کچھ مندرجہ بالا سطور میں بیان کیا گیا ہے اگر آپ نے غور سے سُنا اور پڑھا ہے تو آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ تصوّف اور اس کا مقصد کیا ہے اور اس میں کمال حاصل کرنے والے کیا کرتے ہیں۔

اب اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اپنے زمانہ کے صوفیوں اور بزرگوں کا مقابلہ اُن بزرگوں سے کریں جن کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے اور دیکھیں کہ یہ صوفی اور پیر (دو چار فیصدی کو چھوڑ کر) اسلام اور اہل اسلام کی کیا خدمت کر رہے ہیں اور قوم کے لیے کہاں تک مفید یا مُضر ہیں۔

میرا خیال ہے کہ آپ حضرات میں سے شاید ہی کوئی ہو جس کو دس بیس پیروں فقیروں سے ملنے یا ان کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہُوا ہو۔ اس لیے آپ خود فیصلہ کریں کہ یہ پیر فقیر مُعاشرے کے لیے کہاں تک مفید ہیں یا مُضر۔ اُنہوں نے آپکو اللہ، رسولؐ اور روحانیت کے متعلق کیا بتایا ہے۔ ان کی صحبت میں آپ کے اخلاق کی کتنی اصلاح ہوئی ہے۔ کوئی بڑا گاؤں یا قصبہ شاید ہی ایسا ہوگا جہاں دو چار پیر فقیر موجود نہ ہوں۔ ان میں عام طور پر صرف دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ مجذوب قسم کے فقیر جو برہنہ یا نیم برہنہ بیٹھے ہوئے چرس کے دم لگاتے اور طرح طرح کی بڑیں مارتے رہتے ہیں۔ دُوسرے وہ ہیں جو تعویذ گنڈے کرتے ہیں۔ دیہات کے سیدھے سادے لوگ ان سب کو ولی اللہ جان کر ہر وقت ان کے گرد جمع رہتے ہیں اور کوئی ضرورت یا مصیبت ہو خدا پر بھروسہ کرکے اپنے قوت بازو اور عقل سے کام لینے کی بجائے انہی پیروں اور فقیروں کے پاس دوڑے آتے ہیں۔ مجذوبوں سے دُعا کراتے اور دُوسروں سے تعویذ گنڈے لیتے ہیں۔ پھر ان تعویذ گنڈے والوں میں ایسے بھی ہیں جو سفلی عمل اور کالا علم جانتے ہیں اور لوگوں کو بیمار ڈالنے اور تباہ کرنے کے لیے مصروفِ عمل رہتے اور نذرانہ میں بڑی بڑی رقمیں لیتے ہیں۔ جو پیر یا فقیر تھوڑا بہت پڑھے لکھے ہیں اُن کی باتیں سُن کر سر پھوڑنے کو دِل چاہتا ہے۔ درحقیقت ان کی باتوں اور قصے کہانیوں نے جتنا نقصان دین کو پہنچایا ہے اور کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ اِن پیروں کی تعلیم میں سب سے پہلے یہ پڑھایا اور سکھایا جاتا ہے کہ طریقت

شریعت سے بالکل الگ چیز ہے۔ اور اس میں ایسے ایسے راز کی باتیں ہیں کہ اگر کسی نا اہل کو بتا دی جائیں تو وہ کافر ہو جاتے۔ واہ! کیا اچھا علم ہے کہ اگر اس کے اسرار و غوامض کسی کو بتا دئے جائیں تو اُس کا ایمان کامل ہونے کے بجائے اور اُلٹا خراب ہو جاتا ہے۔ کوئی اِن بھلے مانسوں سے پوچھے کہ پھر ایسا علم کوئی مسلمان کیوں سیکھے جس کے حقائق مومن کو کافر بنا دیتے ہیں۔ استغفر اللہ۔

یہ باتیں آج کل کے جاہل صوفی اور ملنگ وغیرہ ہی نہیں کرتے پُرانے زمانہ کے بزرگوں میں سے بھی اکثر یہی کچھ کہہ گئے ہیں۔ یقین نہ آئے تو تصوّف کی مشہور و معروف کتابیں اُٹھا کر پڑھ لیجیے۔ آئیے میں آپ کو ایک قصّہ سناؤں جو میں نے اکثر صوفیوں کی زبانی سنا اور بعض کتابوں میں بھی پڑھا ہے۔

راوی کہتا ہے "کہ فقیری لاکھوں، کروڑوں آدمیوں میں سے کسی ایک کو ملتی ہے۔ لیکن جب مل جاتی ہے تو کسی طرح ضائع نہیں ہوتی۔ خواہ وہ فقیر زنا کرے۔ شراب پئے۔ حرام کھائے۔ چوری یا قتل کرے"۔ چنانچہ ایک دن کا ذکر کہ جناب حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانی رح اپنے بالاخانہ کی کھڑکی میں بیٹھے تھے۔ نیچے سڑک پر ایک کنواں تھا۔ اتفاقاً ایک آدمی اس میں گر گیا۔ سارے محلّے میں شور مچ گیا اور لوگ اُسے نکالنے کو دوڑے۔ یہ لوگ ابھی نزدیک بھی نہ آنے پائے تھے کہ حضرت بہاء الدین رح نے بالاخانہ پر بیٹھے بیٹھے وہیں سے کنوئیں میں ہاتھ ڈال کر اُس آدمی کو باہر نکال لیا۔ یہ دیکھ کر پھر شور ہوا اور لوگ اُن کی اِس کرامت کی تعریف کرنے لگے۔ ایک گدڑی پوش فقیر وہاں سے گذر رہا تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر حضرت بہاء الدین رح سے کہنے لگا "صاحبزادے یہ تو بھان متی کا کرتب ہے فقیری نہیں ہے"۔ حضرت صاحب نے جب سُنا تو بالاخانہ سے نیچے اُترے اور فقیر کے پاس پہنچ کر پوچھا کہ "بابا اگر یہ بھی فقیری نہیں ہے تو پھر فقیری کیا ہے"؟

فقیر نے جواب دیا :

" فقیری یہ ہے کہ نہ شراب سے ضائع ہو نہ زنا سے جائے نہ حرام کھانے سے اُس میں کوئی نقص آئے "۔ یہ کہہ کر فقیر تو چلا گیا اور آپ یہ سوچتے ہوئے گھر آئے کہ اس کو آزمانا چاہیے کہ جیسا کہتا ہے ایسا ہی ہے یا یونہی ڈینگ مارتا ہے۔ چنانچہ دو تین دن بعد آپ نے ایک کتا کٹوا کر اُس کا پلاؤ پکوایا، ایک شراب کی بوتل خریدی اور اپنی لونڈی سے کہا کہ اچھے کپڑے پہن اور خوب بن ٹھن کر یہ پلاؤ اور شراب کی بوتل لے کر دریا پار فلاں جگہ اس نام کا فقیر رہتا ہے اُس کے پاس جا اور یہ شراب اور پلاؤ اُس کو دے۔ اور اگر وہ تجھ سے بھی کوئی ارادہ کرے تو انکار نہ کرنا چنانچہ لونڈی فقیر کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ فقیر نے پلاؤ کھایا شراب پی اور لونڈی سے بھی متمتع ہوا۔ پھر لونڈی سے کہا کہ جا بہاء الدین سے کہہ دینا کہ شراب۔ کتے کے پلاؤ اور کنیزک کی قربت سے کہیں فقیری جاتی ہے۔ لونڈی نے آکر یہ ماجرہ سُنایا تو حضرت بہاء الدینؒ اُس کے کشف پر حیران رہ گئے۔ خود اُس سے ملنے کا ارادہ کیا۔ اور ایک دن گھوڑی پر سوار ہو کر اُس کی ملاقات کو گئے۔ راستہ میں دریا تھا۔ جب بیچ دریا میں پہنچے تو گھوڑی نے پیشاب کر دیا۔ فقیر جو دُوسرے کنارے سے دیکھ رہا تھا چلایا کہ "صاحبزادے یہ کیا کیا۔ تمہاری گھوڑی نے تو سارا دریا ناپاک کر دیا۔ اب مخلوقِ خدا پانی کہاں سے پیئے گی"۔ حضرت صاحب نے جواب دیا کہ "واہ بابا تم تو فقہ کے معمولی مسائل سے بھی واقف نہیں۔ دریا بھی کہیں گھوڑے کے پیشاب سے ناپاک ہوتا ہے"۔ فقیر نے کہا "جب اتنا چھوٹا سا دریا پیشاب سے ناپاک نہیں ہوتا تو معرفت کا دریائے ذخّار اور بحرِ ناپیدا کنار ذرا سی شراب، کتے کے پلاؤ اور زناء سے کس طرح ناپاک ہو سکتا ہے"۔

سُنا آپ نے۔ یہ ہے وہ تصوّف جس کی تعلیم یہ جاہل صوفی اور پیر لوگوں کو دیتے ہیں۔ اور یہی ہیں وہ رازِ درونِ پردہ کہ اگر کسی مومن کو بتا دئے جائیں تو وہ کافر ہو جائے۔ یہ ایک حکایت تو مَیں نے آپ کو نمونے کے طور پر سُنائی ہے۔ ایسی ایسی ایک دو نہیں۔ دس بیس نہیں۔ سو دو سو نہیں۔ ہزاروں کہانیاں اِن صوفیوں میں مشہور ہیں۔ اور مشہور ہی نہیں تصوّف کی اکثر کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں جنکو لوگ خوب چٹخارے لے لے کر پڑھتے اور جھُوم جھُوم کر دُوسروں کو سناتے ہیں۔ صرف یہی نہیں اِن کم بختوں نے تو ہمارے حضور سرورِ کائنات ؐ کے متعلق بھی ایسے ایسے قصّے گھڑ رکھے ہیں اور ایسے ایسے گندے شعر لکھے ہیں کہ پڑھ کر دِل کانپتا اور رُوح لرزتی ہے۔ مجھے ایسی بہت سی چیزیں اور شعر یاد ہیں۔ مگر بہ لحاظ و پاسِ ادب لکھنا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں تو کسی بھی مسُلمان کی آنکھ ایسی باتیں پڑھنے کے لیے کھُلی نہیں رہ سکتی اور کسی بھی مومن کے کان یہ خرافات سننے کی تاب نہیں لاسکتے۔

اچھا تو اب حقیقت یہ ہے کہ یہ کہانی جو مَیں نے آپ کو سنائی ہے بالکل غلط، لغو اور جناب حضرت بہاءالدین رحمت اللہ علیہ کی ذات گرامی پر ایک کھُلا بہتان بلکہ رکیک حملہ ہے۔ آپ کی ذات مبارک اِن لغویات سے بہت ارفع و اعلیٰ تھی۔ آپ کا علم، آپ کا تقوی اور آپ کی پاک بازی کے ہزاروں ثبوت موجود ہیں اور آپ کے متعلق یہ گمان کہ آپ نے شراب خریدی، کتّے کا پلاؤ پکوایا اور اپنی کنیز کو اُس فقیر کے پاس بھیجا کوئی نہایت ہی جاہل عقل سے عاری اور دنی الطبع آدمی ہی کرسکتا ہے۔ اسی طرح دُوسرے بزرگوں خصوصاً جناب غوث الاعظم ؒ کے متعلق ہزاروں قصّے مشہور ہیں جو سب غلط اور سراپا لغو ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جس طرح زندیقوں کی ایک منظم جماعت جھوٹی حدیثیں گھڑ کر اسلام کی ظاہری تعلیم کو خراب کرنیکی کوشش کرتی رہتی ہے اسی طرح صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے نام سے بھی یہ

سب قصّے کسی خاص سازش کے ماتحت منظم طور پر گھڑے اور بیان کیے گئے ہیں۔ اس لیے کوئی سلیم الطبع آدمی جس کو دین اسلام سے ذرا سی بھی واقفیت ہے ان پر یقین نہیں کر سکتا۔

اب قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب قرآن، احادیث اور حضور اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے تو پھر مسلمان ان جاہل اور گمراہ صوفیوں کے معتقد کیوں ہو جاتے ہیں۔ تو اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ عام مسلمان جاہل ہیں۔ اُن کو نہ قرآن کی خبر ہے نہ احادیث کی نہ وہ حضور اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے واقف ہیں۔ دوسری وجہ قوم کی غربت و افلاس ہے۔ لوگ مفلسی اور غریبی کی وجہ سے بلند عزائم اور اعلیٰ کردار سے عاری ہو چکے ہیں۔ وہ حرام حلال اور جائز و ناجائز کی پروا نہیں کرتے۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ اُن کی مُراد پوری ہو جائے خواہ جائز طریقے سے ہو یا ناجائز سے۔ اِس کے ساتھ ہی اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ فقراء کو مافوق الفطرت طاقتیں حاصل ہوتی ہیں اور وہ انسان کی ہر مُراد پوری کر سکتے ہیں۔

تیسری وجہ (اور سب سے بڑی وجہ) یہ ہے کہ وہ اِن مجذوبوں، ملنگوں اور غیر شرعی فقیروں سے کرامتیں بھی سرزد ہوتی دیکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ عوام متشرّع اور غیر متشرّع کا لحاظ کیے بغیر ہر فقیر کے پاس دوڑے چلے جاتے ہیں۔ اس تمام قضیّہ میں سب سے عجیب اور حیران کن یہی کرامات ہیں۔ جاہل اور بے پڑھے لکھے تو رہے ایک طرف بڑے بڑے تعلیم یافتہ اور عالم و فاضل جب اِن فقیروں سے کرامات صادر ہوتی دیکھتے ہیں تو اُن کے معتقد ہو جاتے ہیں۔

یہ ایک ایسا معمّہ ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہ فقراء جھوٹے اور گمراہ ہیں تو ان سے کرامتیں کیوں ظہور میں آتی ہیں۔ مَیں خود پچیس تیس برس سخت حیران و پریشان رہا۔ میری سمجھ میں کسی طرح بھی نہ آتا تھا کہ جب یہ لوگ طہارت"

عبادت، اخلاق اور ہر اچھی چیز سے کورے ہیں تو پھر ان سے کرامتیں کیوں صادر ہوتی ہیں۔ لیکن آخر کار جب حقیقت سمجھ میں آئی تو معلوم ہوا کہ یہ تو بہت ہی معمولی بات ہے۔

دراصل قصہ یہ ہے کہ تصوّف اور روحانی طاقت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دُوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہر وہ آدمی جو کرامتیں دکھائے ضروری نہیں کہ صوفی بھی ہو لیکن ہر کامل صوفی میں کرامات دکھانے کی طاقت ضرور ہوتی ہے۔ یہ دُوسری بات ہے کہ وہ کرامات دکھائے یا نہ دکھائے۔ تصوّف کا مقصد جیسا کہ اُوپر بتایا جاچکا ہے۔ اللہ اور مبداء و معاد کی حقیقت معلوم کرنا ہے اور اس مقصد تک پہنچنے کا راستہ نیکی۔ پارسائی و پاکبازی۔ تزکیۂ اخلاق اور تصفیہ قلب ہے لیکن روحانی طاقت حاصل کرنے کا مقصد صرف خرق عادات یعنی کرامات کا حصول ہے۔ اور اس کے لیے کسی خاص نیکی۔ پارسائی۔ اخلاق حسنہ اور عبادت کی ضرورت نہیں۔ یہ طاقت تو ایسی چند مشقوں اور ریاضتوں سے پیدا ہو سکتی ہے جیسی کہ ہندوؤں کے یوگ میں کی جاتی ہیں۔ اس طاقت کو حاصل کرنے کے لیے صرف دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک ارتکاز خیال (کنسنٹریشن) دُوسری قوتِ ارادی (وِل پاور) یہ دو باتیں جس کسی میں بھی کمال کے درجے تک پیدا ہو جائیں اُسی سے کرامتیں سرزد ہونے لگتی ہیں۔ اور یہ دو باتیں چند خاص مشقوں سے پیدا ہو جاتی ہیں۔

زیادہ آسانی سے سمجھانے کے لیے میں آپ کو مسمریزم اور ہپناٹزم کا حوالہ دیتا ہوں۔ آپ لوگوں میں سے جس نے بھی کسی اچھے مسمرائزر یا ہپناٹسٹ کے کمالات دیکھے ہیں وہ خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ کیسے عجیب عجیب کرتب دکھا سکتے ہیں۔ ایک معمولی سا کرتب تو یہ ہے کہ کسی کمزور قوّتِ ارادی والے بچے پر اپنی قوّتِ

ارادی سے غنودگی یا نیند طاری کر دیتے ہیں جو اصطلاح میں قوتِ مقناطیسی کہلاتی ہے۔ جب اُن کا معمول بے ہوش ہو جاتا ہے (یا سو جاتا ہے) تو اس سے طرح طرح کے سوال کرتے ہیں اور وہ ہر سوال کا بالکل صحیح جواب دیتا ہے۔ لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ معمول صرف اُنہی باتوں کے صحیح جواب دے سکتا ہے جو عامل یعنی مسمریزم کرنے والا خود جانتا ہو۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اکثر امراض کا علاج بھی کرتے ہیں جو روحانی طریقۂ علاج کہلاتا ہے۔ یہ مرض کو اپنی قوتِ ارادی سے سلب کر لیتے ہیں۔ یہ طریقۂ علاج آج کل یورپ میں بہت مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ بڑے بڑے فلاسفر اور سائنسدان ہپناٹزم کی اس طاقت سے حیران ہیں حتیٰ کہ امریکہ کے مشہور زمانہ فلاسفر ولیم جیمز نے اپنی تحریروں میں جا بجا اس طریقۂ علاج کا بڑی شدّ و مد سے ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ہپناٹسٹ اور بھی کئی کمالات دکھاتے ہیں مثلاً ٹرانسفرلیشن آف تھاٹس (انتقالِ خیال اپنے دماغ سے دُوسرے کے دماغ میں) خواہ وہ آدمی نزدیک اور سامنے ہو یا دُور کہیں فاصلے پر ہو۔ اسی کو ٹیلی پیتھی بھی کہتے ہیں۔ مَیں نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ یہ ہپناٹسٹ مادی ٹھوس چیزوں کی طرف نظر جما کر اشارہ کرتے ہیں اور وہ چیزیں اُن کی طرف سرکنے لگتی ہیں۔ مگر یہ عمل زیادہ وزنی چیزوں پر نہیں کر سکتے صرف ہلکی پھلکی چیزوں پر کر سکتے ہیں مثلاً قلم۔ پنسل۔ ماچس بکس اور گلاس وغیرہ۔

مسمریزم اور ہپناٹزم کی طاقت زیادہ ہو جائے تو آدمی مُردوں کی روحوں کو دیکھنے اور بلانے پر بھی قادر ہو جاتا ہے۔ بعض اشخاص میں یہ طاقت قدرتی اور پیدائشی ہوتی ہے۔ یہ لوگ اصطلاح میں میڈیم کہلاتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ میں بہت سی جماعتیں ہیں جو یہی کام کرتی ہیں۔ یہ جماعتیں سپریچول سوسائیٹز کہلاتی ہیں۔ یہ لوگ مرے ہوئے انسانوں کی روحوں کو بلا لیتے ہیں

اور اُن سے طرح طرح کے سوالات کر کے بڑی اہم معلومات حاصل کرتے ہیں۔ لوگوں کو اُن کے رشتہ داروں کی روحوں سے ملاتے ہیں، روحوں کے فوٹو لیتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی روحوں کو بلا کر بیماروں کے امراض تشخیص اور تجویز کراتے ہیں۔ ہمارے ہاں مشرق میں بھی ایک ایسا ہی علم موجود تھا جو حاضرات کہلاتا تھا۔ اب اِس کے جاننے والے مفقود ہیں۔ البتہ دھوکے باز مدّعی بہت ہیں جو طرح طرح سے لوگوں کو فریب دے کر اُن کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔

الغرض! یہ علوم ہیں جو خاص طریقوں پر عمل کرنے سے ہر آدمی کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ مگر تصوّف سے اِن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ اِن کے لیے کسی خاص پارسائی، تقویٰ اور عبادت و عقائد کی ضرورت ہے۔ ہمارے اکثر پیر اور فقیر بھی مخصوص مشقیں کر کے یہ طاقتیں حاصل کر لیتے ہیں اور عوام پر اپنی ولایت کا رعب ڈالتے ہیں۔ میں بذاتِ خود ایسے کئی مشہور پیروں سے واقف ہوں۔ ہمارے اِن پیروں اور یورپ کے لوگوں میں فرق یہ ہے کہ یورپ والے یہ سب کچھ بدرجۂ کمال حاصل کرنے کے باوجود ولایت کا دعویٰ نہیں کرتے۔ اپنے آپ کو سپرچولسٹ ہی کہتے اور ظاہر کرتے ہیں۔ اور ہمارے ہاں ہر وہ شخص جس میں تھوڑی سی بھی یہ طاقت پیدا ہو جائے وہ ولایت سے اِدھر تو رکتا ہی نہیں۔ بس چلے تو نبوت کا دعویٰ بھی کر بیٹھے

میرے خیال میں متذکرۂ صدر بیانات سے اِن کرامات کی حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آ گئی ہو گی۔ اب میں کچھ تھوڑا سا حال کشف کا بھی بیان کیے دیتا ہوں۔ دراصل گزشتہ یا آئندہ واقعات کو معلوم کرنے کی جستجو انسان کو شاید ابتدائے آفرینش ہی سے رہی ہے۔ چنانچہ عہدِ عتیق میں ایسے کئی علوم پیدا ہوئے اور آج تک موجود ہیں جو انسان کا ماضی یا مستقبل بتا سکتے ہیں۔ اِن میں سے نجوم، رمل، جفر، علمِ قیافہ اور علم الید بہت مشہور ہیں۔

اب ہمارے جعلی پیروں میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جو ان میں سے کسی علم خصوصاً نجوم میں مہارت تامہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اب جو کوئی ان سے ملنے آتا ہے تو وقت اور ساعت دیکھ کر اور کبھی کبھی اُس کا نام معلوم کر کے نجوم کے ذریعہ اس کی دو چار گذشتہ باتیں بتا دیتے ہیں اور سننے والا لامحالہ اُن کا معتقد ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پیر صاحب مستقبل کے متعلق جو کچھ بھی بتائیں خواہ وہ غلط ہو یا صحیح وہ شخص خواہ مخواہ یقین کر لیتا ہے۔ بعض آدمی جو ستارۂ سہیل کی ساعت میں پیدا ہوتے ہیں اُن میں یہ طاقت فطرتی ہوتی ہے۔ جو کچھ اُن کے مُنہ سے نکل جاتا ہے اکثر صحیح ہوتا ہے۔ بعض پیر نفسیات اور قیافہ کی مدد سے دو چار اگلی پچھلی باتیں بتا دیتے ہیں۔ بعض نہایت چالاک لوگ جو ہپناٹزم میں اچھی مہارت رکھتے ہیں یہ چالاکی کرتے ہیں کہ اپنی قوتِ ارادی سے سائل کے دِل میں کوئی سوال خود ہی پیدا کر دیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ تمہارے دِل میں یہ خیال یا یہ سوال ہے۔ اب وہ بیچارہ معتقد نہ ہو تو کیا ہو۔ یہ تو طفیں عقل والوں اور سیانوں کی باتیں کشف تو پاگلوں اور مجذوبوں کو بھی ہوتا ہے اور بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بھی پچھلی اور اگلی باتیں بتا دیتے ہیں۔

میرے مشاہدے میں اِس سے بھی زیادہ حیران کن باتیں آئی ہیں۔ مَیں نے ایک چھ سال کی لڑکی کو دیکھا جس کی بابت یہ مشہور تھا کہ اس کے سَر پر جِنّ آتا ہے۔ اس لڑکی پر جب دورہ پڑتا اور وہ نیم بیہوش ہو جاتی تھی تو اکثر سوالات کا بالکل صحیح جواب دے دیتی تھی۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ آپ جہاں سے کہیں وہیں سے قرآن شریف سنانا شروع کر دیتی اور رکوع پر رکوع سناتی چلی جاتی حالانکہ وہ الف بے تے بھی نہیں جانتی تھی۔ اسی طرح میں نے ایک ۱۸ سالہ لڑکا دیکھا کہ اس پر جب اسی قسم کا دورہ پڑتا تو انگریزی میں

فصیح و بلیغ تقریر کرنے لگتا۔

الغرض! جسکو تحقیق کا شوق ہو اور وہ تفتیش و تفحّص کرے تو ایسے کئی واقعات بچشم خود دیکھ سکتا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اِن باتوں کی نفسیاتی وجہ نہ تو کسی ماہرِ نفسیات کو معلوم ہے نہ کوئی فلاسفر، سائنسداں یا عالِم دین جانتا ہے۔ نہ ہمارے صوفیا، اور اولیائے کرام ہی نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میں نے بھی تکمیل فقر کے بعد سالہا سال اِس کی تحقیق پر صرف کیے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن جوئندہ یابندہ جب نیوٹن پر کششِ ثقل کا راز منکشف ہوسکتا ہے تو میں کیوں محروم رہتا۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اِس کا کچھ راز مجھ پر منکشف کر دیا جو میں آپ کو بھی بتائے دیتا ہوں لیکن اِس بات کا ذمّہ نہیں لیتا کہ آپ سمجھ بھی جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک بہت ہی عجیب و غریب مخلوق ہے اور اس میں ایسی ایسی مادّی۔ ملکوتی۔ جبروتی اور لاہوتی طاقتیں پنہاں ہیں جو خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ ان میں سے کچھ طاقتیں تو ظاہر ہو چکی ہیں، کچھ ہو رہی ہیں اور کچھ آئندہ ہوں گی اور ممکن ہے کہ کچھ طاقتیں قیامت کے دِن ہی ظاہر ہوں۔ یوں تو انسانی جسم کا ایک ایک عضو، ایک ایک رگ بلکہ ایک ایک ذرّہ کرشمۂ قدرت کا طلسمات خانہ ہے لیکن سب سے زیادہ عجیب اُس کا دماغ ہے۔ انسان سے جتنے بھی نوادرات ظاہر ہوتے ہیں اُن سب کا مآخذ دماغ ہی ہے۔ ماہرانِ نفسیات نے اگرچہ انسانی دماغ کی مادّی ساخت کے متعلق بہت کچھ علم حاصل کر لیا ہے لیکن وہ غیر مادّی قوتیں جو ظہور پذیر ہو کر اُس کے ارادے اور تخیّل کو وجود ظاہری یا مادّی بخشتی ہیں اُن کا مکمل حال نہ اب تک کسی فلاسفر کو معلوم ہوسکا ہے نہ کسی ماہرِ نفسیات کو۔ اِن میں سے خاص خاص

قوتیں یہ ہیں:

ارادہ۔ خیال۔ تصوّر۔ احساس۔ حُزن و مسرّت اور وہ کوالُف جن کا تجربہ صرف شاعروں، مفکّروں اور اولیاء اللہ کو ہوتا ہے۔ فلسفہ میں ان کو مائنڈ یا ذہن کی قوتیں کہتے ہیں۔ تصوّف میں اِن کا نام لطائف ہے۔ مگر تصوّف میں کچھ اور لطیفے بھی ہیں۔ قلب۔ سِرّ۔ خفی۔ اخفیٰ۔ نفس۔ عقل اور رُوح۔ اِن کے علاوہ چند اور لطیفے بھی ہیں جن کے لیے ابھی تک کسی زبان میں کوئی نام نہیں ہے۔ ایک کامل صوفی اِن سب کی حقیقت اور ماہیت کو کم وبیش ضرور جانتا ہے۔ اور جب تک اِن سب کا تھوڑا بہت علم نہ ہو کشف و کرامات کے صدور کی اصل حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس چھوٹے سے خطبہ اور ذرا سے وقت میں ان سب کی پوری تفصیل بیان کرنا تو ناممکن ہے۔ صرف اتنا بتایا جا سکتا ہے کہ جیسا ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں۔ انسانی دماغ کے دو حصّے ہیں ایک شعور سے متعلق ہے دُوسرا لاشعور سے۔ (شعور کیا ہے اور لاشعور کیا۔ یہ بات بھی بہت وضاحت طلب ہے لیکن یہاں اس کی بھی گنجائش نہیں) اب ہوتا یہ ہے کہ جب شعور غائب یا فنا ہو جاتا ہے۔ یعنی جب حواس ظاہر کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو لاشعور جاگ اُٹھتا ہے اور اُس کا تعلق عالمِ روحانی یعنی طبقاتِ ملکوت۔ جبروت۔ لاہوت۔ ہاہوت اور ہو وغیرہ سے قائم ہو جاتا ہے۔

اب جاننا چاہیئے کہ جو واقعات اِس عالم مادّی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اُن سب کی تحریک اور روحانی تعمیر عالم قضا و قدر میں ہوتی ہے اور وہاں سے متذکرہ بالا عوالم میں تنزّل کرتی ہوئی اُس عالم مادّی میں ظہور پذیر اور متشکل ہو کر ظاہری حواس کے ذریعہ انسان کے علم میں آتی ہے۔ اس لیے جس آدمی کا لاشعور بیدار ہونے کی وجہ سے ان عوالم سے متعلق ہوتا ہے۔ آئندہ ہونے والے کچھ

واقعات اُس کے لاشعور پر منعکس ہو جاتے ہیں اور ایک کیفیت بیخودی میں اُس کے مُنہ سے نکل جاتا ہے کہ فلاں بات ہونے والی ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس شخص کو تمام عالمِ روحانی کا ہر واقعہ یا ہر بات معلوم نہیں ہوتی بلکہ اس کی رُوح کو اپنے جس قدر ماحول کا علم ہوتا ہے صرف اتنے ہی حِصّہ میں سے تنزّل کرنے والے واقعات معلوم ہو سکتے ہیں۔ اور یہ امر کہ کسی رُوح کا ماحول کتنا وسیع ہے اُس کی لطافت اور طاقت پر منحصر ہے۔

الغرض اِس طرح وہ باتیں جو اس دُنیا میں کچھ وقت بعد ظاہر ہونے والی ہیں اُس کو پہلے سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ یہی کشف کہلاتا ہے۔ پاگلوں اور مجذوبوں سے جو کشف کی باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اُن کا سبب بھی یہی ہے کہ اُن کے حواس ظاہر معطل اور لاشعور بیدار ہوتا ہے۔ یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اُن کا لاشعور ہر وقت ہی بیدار رہتا ہے۔ ہرگز نہیں صرف کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ اُوپر جو واقعہ قرآن پڑھنے والی لڑکی اور انگریزی بولنے والے لڑکے کا بیان کیا گیا ہے اُس کی توضیح بھی یہی ہے۔ چونکہ یہ لڑکی اور لڑکا اُس وقت عالم بے ہوشی میں ہوتے تھے اور اُن کے ظاہری حواس معطل ہو جاتے تھے اس لیے اُن کا لاشعور جاگ اُٹھتا تھا۔ اس حالت میں اُس لڑکی کی رُوح کا تعلق کسی مُردہ یا زندہ حافظ قرآن کی رُوح سے عارضی طور پر قائم ہو جاتا تھا اور وہ قرآن پڑھنے لگتی تھی۔ اسی طرح لڑکے کی رُوح کسی انگریزی خوان کی رُوح سے پیوستہ ہو جاتی تھی اور وہ انگریزی بولنے لگتا تھا۔

یہ باتیں مَیں نے اپنی طرف سے تو نہایت آسان اور سادہ زبان میں زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کی ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ ہمارے حلقہ کے اُن چند حضرات کو چھوڑ کر جنھوں نے تعمیر ملّت کو بہت غور و خوض سے پڑھا اور سمجھا

ہے اور کسی کی سمجھ میں اچھی طرح نہ آئی ہوں گی۔ اس معاملہ میں مَیں مجبورِ محض اور معذور ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ روحانیت کے متعلق جتنی چیزوں کا حال ہم کو بیان کرنا پڑتا ہے اُن کی نہ تو کوئی مثال اِس عالم مادّی میں موجود ہے نہ ہماری کسی زبان میں اُن کے کماحقہٗ اظہار کے لیے مناسب الفاظ موجود ہیں۔ اِس لیے ان کی اصل حقیقت صرف وہی سمجھ سکتے ہیں جو کر کے دیکھتے ہیں۔ پڑھنے یا سننے سے یہ حقیقت ہرگز سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ کسی نے خوب کہا ہے:

۸ محبّت سمجھی جا سکتی ہے سمجھائی نہیں جاتی

بالکل یہی بات لطائفِ روحانی پر بھی صادق آتی ہے اور سچ پوچھو تو محبّت بھی ایک لطیفۂ روحانی ہے۔ اس وقت مجھے حضرت مولانا رومؒ کا ایک شعر یاد آیا فرماتے ہیں۔

چشم بند و لب بہ بند و گوش بند   گر نہ بینی سرّ حق بر من بہ خند

یعنی آنکھ، مُنہ اور کان بند کر لے اگر اس پر بھی رازِ حق تجھ کو نہ معلوم ہو سکے تو جتنا دل چاہے میرا مذاق اُڑانا۔ یہاں آنکھ، مُنہ اور کان بند کرنے سے یہ مُراد ہرگز نہیں کہ ہاتھوں سے اِن کو بند کر لو۔ آنکھوں پر پٹّی باندھ لو۔ کانوں میں روئی ٹھونس لو اور ہونٹوں کو گوند سے چپکا لو جیسا کہ ہمارے بہت سے سالک کیا کرتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کامل نفی کرنا سیکھو تاکہ تمہارے یہ حواس معطّل ہو جائیں اور تم عالمِ روحانی کے اسرارِ ربّانی کا مشاہدہ کر سکو۔

اُمید ہے کہ اب آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ کشف و کرامات کے صدور کا اصل سبب کیا ہے۔ اگر یہ سب کچھ آپ کی سمجھ میں نہ آیا ہو تب بھی اتنا یقین تو ضرور آ گیا ہوگا۔ کہ صرف کشف و کرامات کی وجہ سے کسی کو ولی اللہ ہرگز نہ ماننا چاہیے۔ اولیاء اللہ میں بھی یہ طاقت انہکاز خیال اور قوّتِ ارادی ہی سے پیدا ہوتی

ہے۔ لیکن اُن کا طریقۂ کار کچھ اور ہوتا ہے اور جتنی یہ طاقت ان میں ہوتی ہے نہ کسی مسمرائزر اور ہپناٹسٹ میں ہوتی ہے نہ کسی یوگی اور جوگی میں۔ اُن کے لیے یہ سب کچھ بہت معمولی باتیں ہیں۔ اور اُن میں یہ طاقت بالکل ابتدا ہی میں پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اُن کا مقصود چونکہ اللہ کی معرفت ہے۔ اس لیے وہ اپنا وقت اِن پر خراب نہیں کرتے۔ تصوّف کے جو مبتدی اس طاقت پر نازاں ہو کر یہ تماشے دکھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں وہ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے نامراد رہ جاتے ہیں۔ عوام چونکہ کرامتوں کے بہت معتقد ہوتے ہیں اس لیے پہلے زمانہ کے اولیاء لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے کرامتیں دکھایا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں سائنسی ایجادات و اکتشافات کی وجہ سے چھوٹی موٹی کرامتوں کی کوئی قدر اہل علم کی نظر میں نہیں ہے۔ وہ اِن باتوں کو شعبدہ بازی سمجھتے ہیں۔ مثلاً اُن سے کہو کہ فلاں بزرگ ہوا میں اُڑ سکتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ وہ تو اکیلا ہی اُڑتا ہے۔ ہمارے ہوائی جہاز تو سینکڑوں آدمیوں اور ہزاروں من بوجھ کو اُڑا لے جاتے ہیں۔

مَیں نے ایک انگریز سے کہا کہ ہمارے اولیاء اللہ اپنی آواز ہزاروں میل دُور پہنچا سکتے ہیں تو وہ کہنے لگا کہ یہ تو کوئی بات نہیں۔ ہمارے وائرلیس تو ہماری آواز سنا روں تک پہنچاتے اور وہاں کی آواز بھی سُن سکتے ہیں"۔ اسی طرح ایک دفعہ ایک مجلس میں ذکر آیا کہ فلاں بزرگ پانی پر اس طرح چلتے تھے کہ جیسے ہم خشکی پر چلتے ہیں تو ایک دوست بولے کہ "وہ تو اکیلے ہی دریا پار کرتے تھے۔ ایک ہندو سیٹھ اس دریا پر پُل بنوا دے اور روزانہ ہزاروں آدمی اور لاکھوں من بوجھ پل کے ذریعہ دریا پار کر جائے تو معاشرہ کے لیے کون زیادہ مفید اور زیادہ قابلِ قدر ہے۔ وہ بزرگ جو اکیلا دریا کو پار کرتا ہے یا وہ ہندو

جس کی وجہ سے خلقِ خدا کو اتنا آرام ملتا ہے"۔ قصہ مختصر مغربی تعلیم یافتہ کرامات وغیرہ کی کوئی خاص قدر نہیں کرتے آج کل تو علم و عمل کا زمانہ ہے اور یہ لوگ پُر کیف و سکون اور راحت و مسرّت سے بھرپور زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ لیکن یہ دولت حصول روحانیت کے بغیر میسّر نہیں آسکتی۔

لہٰذا ان کو تصوّف کی وہ اعلیٰ تعلیم دینی چاہیئے جو کشف و کرامات کی شعبدہ بازی سے بلند و برتر ہو اور ان کی دُنیا کو جنّت بنا دے۔

پچھلے سال کے خطبہ میں مَیں نے بتایا تھا کہ تصوف کی دُو قسمیں ہیں۔ ایک سکری۔ دُوسری صحوی۔ آج میں ان دونوں کی کچھ تشریح کروں گا۔ دراصل طریقت کی بے شمار منزلیں طے کر کے عرفانِ ذات باری تعالےٰ تک پہنچنے کے صرف دو راستے ہیں۔ ایک راستہ عشق کا ہے جو جذب کہلاتا ہے۔ دُوسرا عبادت و تقویٰ کا ہے جس کو سلوک کہتے ہیں (آج کل دونوں طریقوں کے لیے ایک لفظ "سُلوک" ہی استعمال ہوتا ہے) جذب سے انسان پر ایک ایسا نشہ طاری ہوتا ہے اور ایسی بے خودی پیدا ہوتی ہے کہ بعض اوقات گھنٹوں تک اپنے وجود کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ لیکن سلوک میں نشہ ہوتا ہے نہ بیخودی۔ سلوک کے طریقہ سے انسان ایک مدت دراز میں منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے لیکن جذب کی راہ سے صرف چند ماہ یا چند سال میں وہ گوہرِ مقصود کو پالیتا ہے۔ جذب کے راستہ کو راہِ قلندری بھی کہتے ہیں۔ عراقی نے مندرجہ ذیل شعر میں اسی راہ کی طلب ظاہر کی ہے۔ کہتا ہے ؎

صنمارہ قلندر سزد ار بہ من نمائی   کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

اس سے یہ نہ سمجھنا کہ جذب کے راستے میں شریعت اور نماز روزہ لازم ہی نہیں ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ کامل بیخودی کی وجہ سے بعض اوقات نماز قضا ہوجاتی ہے تو وہ بعد میں ادا کرلینی چاہیئے۔ صحیح اور آسان ترین راستہ یہی ہے کہ انسان شریعت

کے راستہ پر عشق کے بُراق پر سفر کرے ۔ حلقۂ توحیدیہ کی تعلیم یہی ہے ۔

حلقۂ توحیدیہ کے جن اصحاب نے سلسلہ کی تعلیم پر باقاعدہ عمل کیا وہ اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں کہ اللہ اللہ شروع کرنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد قلب میں ہلکا ہلکا سوز اور سُرور پیدا ہونے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ ایسا نشہ اور بیخودی پیدا ہوتی ہے جس کا مقابلہ دُنیا کی کسی چیز سے نہیں کیا جا سکتا ۔ اِس بیخودی میں ایسا کیف اور مزہ ہوتا ہے کہ انسان ہر قسم کے رنج والم کو بھول کر اسی کا ہو رہتا ہے۔ لیکن یہی کیفیتِ جذب اگر زیادہ بڑھ جائے تو انسان کی عقل جاتی رہتی ہے اور وہ ایسا مجذوب بن جاتا ہے جیسے کہ ہمارے شہروں اور قصبات میں ہر جگہ لنگوٹی باندھے یا بالکل برہنہ پھرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ اس لیے شیخ طریقت کا فرض ہے کہ وہ اپنے مریدوں کے حال پر نگاہ رکھے اور جذب کو حد سے نہ بڑھنے دے ۔ جذب کی اس کیفیت میں انسان کا دِل مطلق نہیں چاہتا کہ کوئی کام کرے ۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ گوشۂ تنہائی میں پڑا اسی کے مزے لوٹتا رہے ۔ نہ اُس کو فقر و فاقہ کی پرواہ ہوتی ہے نہ بال بچوں کے حقوق و فرائض ادا کرنے کا خیال ۔

ظاہر ہے کہ ایسے آدمیوں کی دُنیا تباہ ہو جاتی ہے اور وہ مُعاشرہ پر ایک بارِ گراں ہو کر رہ جاتے ہیں ۔ یہی ہیں وہ لوگ جو پاکستان کے طول وعرض میں جگہ جگہ اڈے جمائے پڑے ہیں ۔ چونکہ بیخودی کے عالم میں کرامات بہت ظاہر ہوتی ہیں اس لیے دُنیا والے عمل اور شرع سب کچھ چھوڑ کر انہی کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ذرا سی مشکل پیش آئے تو کوشش و سعی سے اس کو دُور کرنے کی بجائے سیدھے پیر صاحب یا سائیں بابا کے پاس دوڑے چلے جاتے ہیں ۔ یہ لوگ ایک طرف تو عمل سے عاری ہو جاتے ہیں دُوسری طرف خدا اور رسُولؐ سے بھی غافل رہتے ہیں ۔ ان کو ہر بات کے لیے صرف "بابا" یاد رہتا ہے ۔ یہ "بابا" لوگ خود تو کچھ کرنے

نہیں دُوسروں کو بھی یہی تلقین کرتے ہیں کہ توکل کیئے پڑے رہو تمہاری تقدیر کا حصّہ تم تک خود بخود پہنچ جائے گا۔ یہ اور اسی قسم کے تمام فقیر سکری یعنی نشئی فقیر کہلاتے ہیں اور مُعاشرے کے لیے بے انتہا نباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔

اِن کے بر خلاف وہ سالک ہیں جو "جذب" پر قابو رکھتے ہیں۔ دینی فرائض با قاعدہ ادا کرتے ہیں۔ دُنیا کے بھی سارے کام محنت اور ذوق وشوق سے انجام دیتے ہیں۔ اپنے دینوی فرائض کو جانتے ہیں اور بال بچوّں۔ ماں باپ عزیز و اقارب۔ ہمسایوں اور شہریوں کے تمام حقوق کما حقہٗ پورے کرتے ہیں۔ ان کا کردار ایک شریف۔ بہادر اور غیوّر انسان کا کردار ہوتا ہے۔ ان میں حوصلہ۔ ہمّت۔ جرات۔ خود اعتمادی۔ عمل۔ یقین اور محبّت وغیرہ جیسی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اور ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ اللہ اور رسُول صلعم کے عاشق زار۔ حق آگاہ وحق بیں۔ اوّل درجہ کے عقل مند۔ فرہیں۔ دانشور اور معاملہ فہم ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُن میں روحانی قوّت بھی ہوتی ہے جس سے وہ لوگوں کے دِل موہ لیتے ہیں۔ اگر ایسے لوگوں کی تعداد قوم میں دس فیصدی بھی ہو تو وہ کبھی ذلیل وخوار نہیں ہو سکتی بلکہ دِن رات ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔

الغرض! یہ ہے صحوی تصوّف اور یہ ہیں وہ صحوی صوفی جو مُردوں کو جلاتے اور جینے والوں کو پَر لگا کر اُڑاتے ہیں۔

مَیں نے خطبہ کے شروع میں کہا تھا کہ میں آپ کو بتاؤں گا کہ مَیں نے یہ نیا سلسلہ کس غرض سے قائم کیا ہے اور میں کیا چاہتا ہوں تو اب میں بتاتا ہوں کہ میں آپ کو صحوی تصوّف سکھانا اور انسانِ کامل بنانا چاہتا ہوں۔ مَیں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ حقائق کو چھوڑ کر کوائف میں کھو جائیں۔ دُنیا کا کوئی کام نہ کریں۔ توکل کی چادر اوڑھے شراب معرفت کے نشہ میں مست پڑے کرامتیں دکھایا کریں۔

میں جس راستہ پر آپ کو چلانا چاہتا ہوں وہ بالکل ہمارے سرکارِ ابد قرار احمد مختار صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نقش قدم پر جانا ہے۔ جو کچھ میں کہتا ہوں اُس کو رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ سے ملا لو۔ اگر میں کہیں غلطی پر ہوں تو مجھے آگاہ کردو۔ میں اپنے طریقے میں بڑی خوشی سے ترمیم کر لوں گا۔ جو لوگ اس راستہ پر چلنا نہیں چاہتے اُن کو چاہیئے کہ حلقہ سے الگ ہو جائیں اور کسی ایسے سلسلہ میں شریک ہو جائیں جو اُن کی خواہش اور مرضی کے مطابق ہو۔

اچھا! آیئے اب دُعا کریں کہ اللہ تعالےٰ اِس حلقہ کو کامیاب فرمائے اور ہم سب کو صحیح معنوں میں حضور اکرم رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین۔ یا رب العالمین ؛

خادم الخدام
عبدالحکیم انصاری

لاہور
۱۹ر اپریل ۱۹۶۳ء

(۳)

بڑی خوشی کا مقام ہے کہ پورے ایک سال بعد ہم سب پھر ایک جگہ اکٹھے ہوئے ہیں - آپ جانتے ہیں کہ ہمارا یہ اجتماع مطلق کسی دُنیاوی غرض سے نہیں ہے - ہم میں سے کوئی بھی یہاں اس خیال سے نہیں آیا کہ غریب ہے تو دولتمند بن جائے گا - بے اولاد ہے تو اولاد ہو جائے گی - بیمار ہے تو یہاں سے تندرست ہو کر جائے گا - یا کسی اور مصیبت میں مبتلا ہے تو اُس سے چھٹکارا مل جائیگا - نہ ہمارا یہ اجتماع کسی سیاسی عمرانی یا اقتصادی غرض سے منعقد ہوا ہے - اگر ان باتوں میں سے کوئی بھی بات نہیں ہے - اور یقیناً نہیں ہے تو پھر آپ لوگ یہاں کس لیے آئے ہیں ؟ دُور دراز مقامات سے سفر کی تکلیفیں برداشت کر کے، گھر کے سو کام چھوڑ کے، جیب سے پیسے خرچ کر کے آخر یہاں آنے کا کیا مقصد ہے ؟

یہ بالکل صحیح ہے کہ کوئی شخص بھی بغیر کسی مقصد کے نہ اتنی تکلیف اُٹھاتا ہے نہ مالی طور پر زیر بار ہوتا ہے تو آپ کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد تو ضرور ہوگا - آخر وہ مقصد کیا ہے ؟ آپ کو اس سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں - آپ کی صورتیں ہی اس کا جواب ہیں - خلوص اور محبت ایسی چیز نہیں جو چھپائے چھپ جائیں - آپ کے چہروں سے خلوص کا رنگ جھلکتا ہے اور آنکھوں سے محبت کے فوارے چھوٹ

رہے ہیں۔ یہی نہیں مجھے تو آپ کے دِل کی دھڑکنیں بھی سنائی دے رہی ہیں۔ اور ان دھڑکنوں میں جو نام آپ کے دِل سے نکلتا اور عرش سے ٹکراتا ہے وہ بھی سنائی دے رہا ہے۔ وہ کیا نام ہے؟ بتاؤں! وہ نام ہے "اللہ" کیسا پاک نام ہے۔ کتنا پیارا نام ہے۔ ہمارے خالق کا نام۔ ہمارے مالک کا نام۔ ہمارے محبوب کا نام۔ ہاں تو آپ کا جواب ہے "اللہ"۔ یعنی آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم سب یہاں دِلی خلوص اور محبّت سے صرف "اللہ" کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ آیئے آیئے۔ مَیں آپ سب کو دِل وجان سے خوش آمدید کہتا ہوں اور اُسی اللہ سے جو آپ کا مقصود ہے۔ دُعا کرتا ہوں کہ آپ میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے مقاصد دلی میں کامیاب اور بامُراد فرمائے۔ دین و دُنیا کی دولتوں سے مالا مال کرے۔ اپنی راہ پر اور زیادہ خلوص اور جوش سے چلنے کی توفیق دے۔ اپنی اور اپنے محبوب کی محبّت کے نور سے آپ کے دلوں کو جگمگا دے۔ آپ کی روحوں کو تڑپا دے۔ ہمیشہ صراط المستقیم پر قائم رکھے اور اپنے پیارے رسولؐ کے صدقے یہ ہمّت دے کہ آپ اُمّت محمّدیہ کی خدمت اور فلاح و بہبود کیلئے اپنی جان اپنی رُوح، اپنے جسم کا ایک ایک ذرّہ، اپنی ملکیت کا ایک ایک پیسہ اور اپنے خون کا ایک ایک قطرہ نچھاور کر دیں۔ آمین یارب العٰلمین۔

آیئے اب ہم اُس اللہ کا شکریہ ادا کریں جس نے ہم سب کو ایک سال تک زندہ رکھا۔ صحت دی اور ایک ایسے اجتماع میں شریک ہونے کے قابل کیا جس کی نظیر شاذ و نادر ہی کہیں مل سکتی ہے۔ آپ نے مذہبی۔ سیاسی۔ مُعاشرتی اور شادی بیاہ کے کئی اجتماعات میں شرکت کی ہوگی۔ اس لیے آپ اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں کہ جو لُطف و سرور یہاں آتا ہے اور جو سوز و ساز اور کیف و گداز یہاں ملتا ہے۔ اُس کا عشرِ عشیر بھی کسی دنیوی محفل میں نہیں ملتا۔ ایسا پاک ماحول کہاں

میسّر ہوتا ہے۔ جہاں آنکھیں ہر طرح کی زشت و بدروئی کی طرف سے بے لبقرصرف حسن و خوبی کے جلوے دیکھتی ہیں۔ جہاں کان ہر قسم کی لغو بیانی اور بدکلامی کیطرف سے بند، صرف نغمات لاہوتی اور اصوات سرمدی سنتے ہیں۔ جہاں زبانیں ہر نوع کی بدگوئی اور غیبت و بہتان طرازی کی طرف سے گنگ، صرف حمد و ثنا کے ترانے گاتی ہیں۔ جہاں دل و دماغ ہر بُرے خیال۔ غصّہ۔ نفرت۔ حسد۔ حرص و ہوا اور عناد و فساد کے تمام ناپاک جذبات سے یکسر خالی۔ شراب عشق و محبّت کے نشہ میں چُور۔ دیدار یار کی تمنا میں دنیا و مافیہا سے بالکل غافل و سرمست ہیں۔

الغرض اس اجتماع میں ہر طرف خلوص ہی خلوص۔ پریم ہی پریم اور محبّت ہی محبّت ہے۔ پھر ایسے اجتماع میں شرکت کی توفیق عطا کرنے والے رحیم و کریم آقا کا شکر ہم کیوں نہ ادا کریں۔ حق تو یہ ہے کہ جتنا بھی شکر ادا کیا جائے اور جتنی بھی حمد و ثنا کی جائے کم ہے۔

خدائے قادر و قیوم کے شکر کے بعد میں اپنی اور تمام حلقۂ توحیدیہ کی طرف سے اُن برادرانِ حلقہ لاہور کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں جنھوں نے ہم کو لاہور آنے کی دعوت دی۔ ان میں سب سے پہلے ہمارے شکریہ کے مستحق جناب میاں محمد علی صاحب ہیں۔ یہ صرف اُنہی کے خلوص و محبّت اور ایثار کا نتیجہ ہے کہ ہمارا اجتماع اس مرتبہ پھر لاہور میں ہو رہا ہے۔ میاں صاحب نے پچھلے سال بھی اجتماع کا تقریباً سارا بوجھ خود ہی اُٹھایا تھا اور اس مرتبہ بھی اُن کا یہی اصرار ہے کہ یہ سعادت صرف اُنہی کے حصّہ میں آئے۔ ایسے پُرخلوص اور ایثار مجسم انسان دُنیا میں کہاں ملتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اِن کو دین و دُنیا کی ہر نعمتِ لازوال سے مالا مال فرمائے اور وہ دِن دونی رات چوگنی ترقی کرتے رہیں تاکہ خلقِ خدا کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں۔ آمین

اجتماع کا انتظام اور اہتمام لاہور کے خادم حلقہ جناب محمد قاسم صاحب نے کیا ہے۔ اور اس کے لیے اپنے کاروبار کو نظر انداز کر کے سخت محنت و مشقت سے کام لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اور حلقہ کے اُن تمام بھائیوں کو بھی اپنی عنایات بے پایاں سے نوازے اور دین و دُنیا دونوں میں سرخرو فرمائے جنھوں نے انتظام و اہتمام میں مدد دی اور قاسم صاحب کا ہاتھ بٹایا ہے۔
مَیں قاسم صاحب اور ان سب بھائیوں کا بھی دِلی شکریہ ادا کرتا ہوں اور اُن سب برادران حلقہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جو اپنے سو کام چھوڑ کر اور سفر کی تکلیفیں اُٹھا کر اجتماع میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں۔
اللہ تعالیٰ ان سب کی دِلی مُرادیں بر لائے اور جو لوگ نہیں آئے یا نہیں آسکے اُن پر بھی اپنے رحم و کرم کی بارش کرے۔ آمین

اب آپ مجھے اجازت دیں کہ اصل خطبہ شروع کروں:

سنہ ۱۹۶۲ء کے خطبے میں مَیں نے تصوّف کے متعلق اپنے ذاتی تجربوں کا بیان کیا تھا اور سنہ ۱۹۶۳ء کے خطبے میں تصوّف کی دو قسموں۔ تصوّف سکری اور تصوف صحوی پر روشنی ڈالی تھی اور کشف و کرامات کی قدر و قیمت اور اُن کے ظہور میں آنے کی نفسیاتی وجوہات کا ذکر بھی کیا تھا۔ آج کے خطبے میں آپ کو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تصوّف کا انسان کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ علم کیوں سیکھنا چاہیئے اور اس میں کمال حاصل کرنے کے بعد کیا کرنا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ تصوّف کیا ہے۔ لیکن تصوّف چونکہ مذہب کا حصّہ ہے اس لیے جب تک مذہب کی اہمیّت اور افادیت اچھی طرح ذہن نشین نہ ہو جائے تصوّف کی عظمت اور قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا میں پہلے یہ بتاؤں گا کہ مذہب انسان کے لیے کیوں ضروری ہے۔
مذہب کیا ہے؟ یہ ایک ضابطۂ حیات ہے۔ ایک دستور اور آئین
زندگی جو اللہ تعالےٰ نے انبیائے مرسلین کے توسل سے انسان کی ہدایت کے
لیے نازل فرمایا ہے۔ یہ ضابطۂ حیات اللہ کی طرف سے ضمانت ہے اس بات
کی کہ اس پر عمل کرنے سے انسان امن و امان اور آسائش و آرام کی زندگی بسر
کر سکے گا۔ اور اس قابل ہو جائے گا کہ اللہ کی پیدا کی ہوئی جتنی قوتیں اُس کے دل و
دماغ میں پوشیدہ ہیں وہ سب نشو و نما پا کر بروئے کار آئیں اور انسان اللہ
کے اُن تمام خزانوں کو مسخّر کرے۔ جو زمین و آسمان میں ظاہر یا چھُپے ہوئے ہیں۔
قرآن میں ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ۔
یعنی زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے اللہ نے سب کو تمہارے لیے مسخّر کر دیا ہے۔
غور کیجیے کہ جب ایک معمولی سے قلعہ یا چھوٹے سے شہر کو فتح کرنے کے لیے کس قدر
علم و عقل۔ تجربہ اور سُوجھ بوجھ، ہمت و محنت اور صبر و استقلال درکار ہوتے
ہیں۔ تو زمین و آسمان کی تمام اشیاء کو تسخیر کرنے کے لیے کیا کچھ درکار نہ ہو گا۔
لیکن یہ ناممکن یا محال بھی نہیں ہے۔ ناممکن ہوتا تو اللہ تعالےٰ اپنے کلام میں
ایسا فرماتا ہی کیوں، ویسے تجربہ سے بھی یہی ثابت ہوا ہے کہ انسان زمین و آسمان
کی تمام اشیاء کو مسخر کر سکتا ہے۔ یہی انسان ہے جو کبھی جنگلی جانوروں کی سی زندگی
بسر کرتا تھا۔ ننگا پھرتا۔ خود رُو نباتات اور شکار کے گوشت سے پیٹ بھرتا۔
زمین کے بھٹوں یا پہاڑ کے غاروں میں رہنا اور پیدل سفر کرتا تھا۔ پھر رفتہ
رفتہ کھیتی باڑی کرنا۔ کپڑے بُننا اور سینا۔ جھونپڑیاں اور کچے پکے مکان بنانا۔
بار برداری اور سواری کے لیے جانور سدھانا اور گاڑیاں بنانا سیکھ گیا۔ اور آج

وہی انسان ہے جو کمخواب و زربفت سے بھی زیادہ اچھے کپڑے پہنتا ہے۔ ہزاروں قسم کے لذیذ ماکولات و مشروبات استعمال کرتا ہے۔ سربفلک عمارتیں بناتا ہے۔ ریلوں، جہازوں اور ہوائی جہازوں میں برسوں کا سفر گھنٹوں اور گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے کرتا ہے اور لاکھوں من بوجھ بڑے بڑے سمندروں اور اونچے اونچے پہاڑوں کے پار بہ آسانی پہنچا دیتا ہے۔ اور اب تو خود ہمارا علم و مشاہدہ گواہ ہے کہ وہی انسان جس کے لیے کل تک معمولی پہاڑوں پر چڑھنا یا سمندروں کی تہ تک پہنچنا اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا بھی مشکل تھا۔ آج چاند تاروں میں اپنے راکٹ بھیج کر وہاں کے حالات معلوم کر سکتا ہے، اُس کی آبدوز کشتیاں سمندروں کی تہ میں لگاتار کئی کئی مہینے پڑی رہتی ہیں۔ اُس کے مصنوعی سیّارے کرۂ زمین سے سینکڑوں میل دور فضا میں آدمیوں کو اُڑا کر لے جاتے ہیں اور کئی کئی دِن زمین کے گرد اپنا الگ مدار بنا کر گردش کرتے رہتے ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ یہی انسان کچھ عرصہ بعد زحل، مشتری اور مریخ وغیرہ میں بھی آنے جانے لگے اور دو چار صدی بعد اپنے نظامِ شمسی کے علاوہ دوسرے ستاروں میں بھی اُس کی رسائی ہو جائے۔ انسان کی اِس کامیابی سے صرف مادی فوائد ہی حاصل نہیں ہوتے ہیں بلکہ اُس کے ذہن اور عقل نے بھی بے انتہا ترقی کر لی ہے۔ اور آج وہ اپنے خالق کا پہلے سے کہیں زیادہ معترف و مدّاح ہے۔ مزید سماوی دریافتیں اور اجرامِ فلکی کی تسخیر یقیناً اُس کو خدا سے اور بھی قریب کر دیں گی اور وہ مالک ارض و سماء کی معرفت بدرجۂ اولیٰ حاصل کر لے گا۔

سوال یہ ہے کہ اتنی عظیم الشان اور محیر العقول ترقی انسان کس وجہ سے کر سکا؟

میرا جواب ہے۔ صرف "امن و امان کی وجہ سے"۔ اگر امن و امان کی زندگی میسّر نہ آتی اور انسان جنگلی اور خونخوار درندوں کی طرح جنگ و پیکار ہی میں مصروف

رہتا تو یہ معیشتی ۔ معاشرتی ۔ تمدنی ۔ علمی اور ذہنی ترقی ممکن ہی نہ ہوتی ۔ اور جس آرام و آسائش کی زندگی ہم آج بسر کر رہے ہیں معرض وجود ہی میں نہ آتی ۔

ظاہر ہے کہ یہ سب ترقی بڑے بڑے دانشوروں اور مفکروں کے متواتر غور و فکر اور سائنس دانوں کی لگاتار عملی کد و کاوش اور تجربوں کا نتیجہ ہے ۔ اگر دنیا میں امن و امان نہ ہوتا تو نہ بڑے بڑے مفکروں کو غور و فکر کا وقت ملتا نہ سائنسدان اطمینان و سکون سے نئی نئی دریافتیں اور ایجادیں کرنے کے قابل ہوتے ۔ اب اگر آپ ٹھنڈے دل سے ذرا بھی غور کریں کہ یہ امن و امان انسان کو کس نے دیا تو بڑی آسانی سے سمجھ جائیں گے کہ **مذہب** نے ۔ مذہب ایک سیدھا سادا سا ضابطہ ہے جو صرف ان دو جملوں پر مشتمل ہے :

(۱) یہ کرو ۔ (۲) **یہ مت کرو** ۔ انہی کو مذہبی اصطلاح میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں ۔

مذہب جتنے بھی کام کرنے کا حکم دیتا ہے وہ **خیر** اور جن سے منع کرتا ہے وہ **شر** کہلاتے ہیں ۔ خیر و شر کی صحیح تعریف یہ ہے کہ ہر وہ فعل و قول اور حرکت و سکون جو نوع انسان کی بقا اور تعمیر کا باعث ہو **خیر** ہے اور جو تباہی و تخریب کا سبب بنے وہ **شر** ہے ۔ اس تعریف کو آپ انسانی زندگی کے کسی گوشہ کسی شعبہ اور انسان کے کسی قول و فعل اور حرکت و سکون پر منطبق کر کے دیکھ لیں آپ پر اس کی صداقت آفتاب کی طرح روشن ہو جائے گی ۔ اور آپ اچھی طرح سمجھ جائیں گے کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنی نعمتیں اور دولتیں پیدا کی ہیں اُن سب میں خیر یعنی **امن و امان** ہی سب سے بڑی دولت اور نعمت ہے ۔ یہ کوئی منطقی استدلال یا استنباط نہیں بلکہ ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے جس کو تمام قوموں اور قوموں کے تمام دانشوروں نے تسلیم کر لیا

ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج تمام قومیں ادارۂ اقوام متحدہ میں جمع ہو کر ہر وقت قیامِ امن عالم کی کوشش میں مصروف رہتی ہیں۔

یہ اللہ کا بڑا ہی کرم تھا کہ جب انسان جہالت کی تاریکیوں میں وحشت و بربریت کی زندگی گذار رہا تھا تو اُس نے اُنہی انسانوں میں کچھ خاص بندے پیدا کیے اور ان پر عقل۔ الفاظ۔ الہام اور وحی کے ذریعہ وہ تعلیم نازل کی جو "مذہب" کہلاتی ہے۔ یہی تعلیم ان مقبول بندوں نے (جو پیغمبر کہلاتے ہیں) اپنی قوم کو دی۔ دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ہادی نہ آیا ہو۔ لیکن جس قوم میں بھی کوئی ہادی آیا قوم نے نہ صرف اس کو ٹھکرایا بلکہ طرح طرح کی اذیتیں بھی دیں جیسا کہ تمام پیغمبروں کی سوانحِ حیات سے ظاہر ہے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ تعلیم الٰہی یا قانونِ حق نازل ہونے سے پہلے ہر قوم آزاد اور ہر شخص مختار تھا کہ جو چاہے کرے۔ اُن کے قول و فعل اور اعمال و افکار پر نہ کوئی پابندی تھی نہ کوئی روک ٹوک کرنے والا۔ جب پیغمبروں نے حکمِ الٰہی کے مطابق ان اعمال و افعال وغیرہ پر پابندیاں لگائیں کہ "یہ کرو" اور "یہ مت کرو"۔ تو لوگوں کو سخت ناگوار گذرا اور وہ ناراض ہو کر دشمنی اور ایذارسانی پر اُتر آئے۔ لیکن ان نفوسِ قدسی نے دُنیا کی بڑی سے بڑی مخالفت اور سخت سے سخت اذیت کو پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دی۔ دِن رات اپنا کام جاری رکھا اور مرتے دَم تک اپنے پُر از حکمت و محبّت مواعظ و نصائح سے لوگوں کو سمجھاتے رہے۔ یہاں تک کہ قوم کے ایک بڑے طبقہ نے ان کی بات مان لی اور قانونِ حق کو خود اپنی خوشی سے اپنے اُوپر نافذ کر لیا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ دُنیا میں کسی قانون پر بھی عملدرآمد نہیں ہو سکتا جب تک اُس کی پشت پر کوئی طاقت ایسی موجود نہ ہو جو قانون شکنی کرنے والوں کو سزا دے سکے۔ اِس لیے پیغمبروں نے لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ جس اللہ نے یہ قانون

نازل کیا ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ حاضر و ناظر اور سمیع و بصیر بھی ہے۔ یعنی ہر وقت ہر جگہ موجود ہے اور اپنے بندوں کے تمام اعمال و اقوال کو دیکھتا اور سنتا ہے نہ صرف یہ بلکہ وہ دلی خیالات کو بھی جان لیتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مرنے کے بعد تم کو ایک دن پھر زندہ کیا جائے گا اور تم نے اس دنیا میں جو کچھ کیا ہے اُس کا پورا بدلہ ملے گا۔ اس لیے جو لوگ اس ضابطۂ الٰہی کے خلاف کریں گے اُن کو سخت عذاب دیا جائے گا اور جو اس پر عمل کریں گے اُن کو ہر طرح کی نعمتیں عطا کی جائیں گی۔ لوگوں نے پیغمبروں کی ان باتوں کو بھی مان لیا۔ اس طرح یہ قانون حیات مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گیا اور دنیا امن و امان کی برکتوں سے نہال ہو گئی اور آج جو چہل پہل اور رونق و ترقی ہم دیکھتے ہیں وہ سب اسی ضابطۂ حیات یا بالفاظ دیگر مذہب پر چلنے کا نتیجہ ہے اور وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ کروڑوں انسان ایسے بھی ہیں جو نہ تو خدا کو مانتے ہیں نہ اُس کے مرسلہ ضابطۂ حیات کو۔ اور جو مانتے ہیں ان میں سے بھی سب اس پر سو فیصدی عمل نہیں کرتے اگر دنیا کی پوری آبادی بلا استثنا اس ضابطۂ حیات کی سو فیصدی پابندی کرے تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دنیا صحیح معنوں میں رشکِ فردوس و جناں نہ بن جائے۔

جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ کہتے ہیں کہ خدا۔ رسول۔ وحی۔ الہام۔ حیات بعد الموت اور جنت و دوزخ جیسی کوئی شے بھی موجود نہیں ہے۔ یہ سب من گھڑت افسانے ہیں جو عہد عتیق کے عقلمندوں نے محض اس لیے وضع کیے تھے کہ لوگوں کو ایک نادیدہ قوت کا خوف دلا کر قتل و غارت سے روکا جائے۔

اب انسان اس قدر ایڈوانس ہو چکا ہے کہ اپنے بھلے بُرے اور خیر و شر کو خوب اچھی طرح جانتا ہے۔ اور اپنی قانون ساز اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں میں

ضرورتِ وقت کے مطابق قانون بنا کر امن و امان قائم رکھ سکتا ہے۔ اس لیے اب ایسے خلاف عقل افسانوں پر یقین کرنا بیکار محض ہے۔ ان لوگوں سے میری گذارش ہے کہ چلو یونہی سہی۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے فرض کیے لیتے ہیں کہ آپ ہی سچّے ہیں۔ خدا وغیرہ کوئی بھی موجود نہیں (نعوذ باللہ۔ نقل کفر کفر نہ باشد) اس صورت میں دو عقیدے ہو گئے۔ ایک یہ کہ خدا موجود ہے۔ دوسرا یہ کہ خدا موجود نہیں ہے۔ تو اب ہم کو یہ غور کرنا چاہیئے کہ ان دونوں عقیدوں میں سے کون سا عقیدہ قیام امن و امان میں مدد دے سکتا ہے اور کون سا نہیں دے سکتا۔

اب فرض کیجیے دو آدمی ہیں زیدؔ اور بکرؔ۔ زیدؔ کا عقیدہ ہے کہ خدا صرف موجود ہی نہیں بلکہ حاضر و ناظر، سمیع و بصیر اور قادر و قیوم بھی ہے۔ اگر میں نے ایک بات بھی اُس کے حکم کے خلاف کی تو اس کو فوراً معلوم ہو جائے گا اور وہ مجھے اس دُنیا میں بھی سزا دے گا اور مرنے کے بعد بھی عذاب الیم میں مبتلا کرے گا۔ اس کے برخلاف بکرؔ کا تخیّل کچھ اس انداز کا ہو گا کہ اگر میں نے اپنے مُلکی قانون کے خلاف کچھ کیا اور لوگوں کو یا پولیس کو معلوم ہو گیا تو وہ مجھے گرفتار کر کے چالان کر دے گی۔ اور مجسٹریٹ مجھے سزا دیدے گا۔ اُسے بہت فکر ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی خیال آتا ہے کہ پولیس کو رشوت دی جا سکتی ہے وہ نہ مانے تو شاید مجسٹریٹ ہی رشوت قبول کر لے۔ یہ بھی نہ ہُوا تو پھر میں ایک بہت قابل وکیل کر لوں گا اور گواہوں کو روپیہ یا کسی کے اثر و رسوخ سے مجبور کر دوں گا کہ میرے خلاف گواہی نہ دیں۔

اب بتایئے ان دونوں میں سے کون قانون شکنی کر سکتا ہے۔ زیدؔ جو خدا کو مانتا ہے یا بکرؔ جو نہیں مانتا۔ اچھا! یہ تو تھا ایسے مواقع کا حال جہاں پولیس

یا لوگوں کے دیکھ لینے کا خدشہ ہوتا ہے۔ لیکن انسان کی زندگی میں تو ایسے موقعے بھی اکثر آتے ہیں جہاں پولیس یا لوگوں کو علم ہو جانے کا مطلقاً کوئی امکان ہی نہیں ہوتا اور انسان کو سو فیصدی یقین ہوتا ہے کہ اس کے جرم کا حال کبھی بھی کسی کو معلوم نہ ہو سکے گا۔

اب بتائیے کہ ایسے موقعوں پر ارتکابِ جرم کون کر سکتا ہے وہ شخص جو خدا پر ایمان رکھتا ہے یا وہ شخص جو صرف پولیس اور عدالت کے خوف سے قانون شکنی نہیں کرتا۔

اُمید ہے کہ اب مذہب کی ضرورت و اہمیت آپ کی سمجھ میں آ گئی ہو گی اور آپ یہ مان گئے ہوں گے کہ انسان کی تعمیر و بقا کے لیے مذہب اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ پانی اور ہوا۔ اور اگر اب بھی آپ کی تسلّی نہ ہوئی ہو تو دو منٹ کے لیے تصویر کے دُوسرے رُخ پر بھی غور کر لیں اور ایک ایسے خطۂ زمین کا تصوّر کریں جہاں کوئی قانون موجود نہیں۔ لاقانونیت اور انارکی کا دَور دورہ ہے۔ نہ کوئی حاکم ہے نہ عدالت۔ نہ کوئی ضابطۂ تعزیر۔ ہر شخص اپنی خواہشات کا غلام اور اپنی مرضی کا مالک ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ایسے مقامات پر صرف ایک ہی قانون چلتا ہے "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس"۔ یہاں کسی کو بھی اپنے جان و مال۔ بیوی بچوں اور عزّت و آبرو کی طرف سے اطمینان نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص محنت و مشقت سے کچھ پیسہ بچاتا ہے۔ مکان بناتا ہے اور کچھ سامان اکٹھا کرتا ہے کہ ایک دن اچانک دس پانچ آدمی آ جاتے ہیں اور اُس کو مار ڈالتے ہیں یا جو کچھ اُس کے پاس ہے لوٹ کر لے جاتے ہیں اور وہ دیکھتے کا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ایسے مقامات پر نہ تمدّن ترقی کر سکتا ہے، نہ تہذیب پھیل سکتی ہے، نہ آدمی کی عقلی اور ذہنی قوتیں نشوونما پا سکتی ہیں۔ ایسی

زندگی کا صحیح تصوّر ہمارے لیے اس واسطے ممکن نہیں کہ ہم متمدن دُنیا میں رہتے ہیں۔ اپنی محنتوں کا پُورا نہیں تو کچھ نہ کچھ ثمرہ ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ اپنی جائز تمناؤں اور خواہشات کو بڑی حد تک پورا کر سکتے ہیں۔ اپنے اہل و عیال اور دوستوں کی محبّت کا لُطف اُٹھا سکتے ہیں۔ رات کو پاؤں پھیلا کر سوتے اور صبح کو ہنستے اور مسکراتے اُٹھتے ہیں۔ ہمارے مُعاشرے میں بھی بہت سی تکلیفیں اور پریشانیاں موجود ہیں۔ لیکن وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ مُعاشرے کے تمام افراد خدائی قانون یعنی مذہب پر پُوری طرح عمل نہیں کرتے۔

اگر آپ لاقانونیت اور انارکی کی زندگی کا صحیح تصور کرنا چاہتے ہیں تو سکندر اعظم، چنگیز خان اور ہلاکو خاں جیسے لیڈروں کے حالات پڑھیں۔ جنہوں نے قانون اور امنِ عالم کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اور دیکھیں کہ جن ممالک کو اُنہوں نے تاخت و تاراج کیا تھا وہاں اُس زمانہ لاقانونیت میں انسانی زندگی کی کیا قیمت تھی۔

۱۸۵۷ء میں خود ہندوستان پر جو مصیبت آئی اس کے حالات بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ دُور کیوں جائیں ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہونے پر دہلی، مشرقی پنجاب اور یو۔پی کے چند مغربی اضلاع پر جو آفت آئی اور ہندوؤں نے مسلمانوں پر جو قیامت ڈھائی اس کے چشم دید گواہ آج بھی لاکھوں موجود ہیں۔ مجھے خود بھی ان واقعات کا بہت سا ذاتی علم و تجربہ ہے مگر بخوف طوالت بیان نہیں کر سکتا۔ صرف یہ دُعا کرتا ہوں کہ اللہ ایسی مصیبتیں دشمنوں پر بھی نہ ڈالے۔ فساد زدہ علاقہ میں کئی ماہ تک وہ افراتفری اور پریشانی رہی کہ کسی مسلمان کو دو منٹ کے لیے بھی اطمینان کا سانس لینا نصیب

نہ ہُوا۔ دو چار دِن تو بہت ہیں۔ دو چار منٹ کا بھی بھروسہ نہ تھا کہ خدا جانے کیا ہو جائے۔ یہ سب کچھ کیوں ہُوا محض اسی لیے کہ کوئی قانون باقی نہ رہا تھا۔ اور وہ امن و امان مفقود ہو گیا تھا جس کو قائم رکھنے کا حکم خدا نے مذہب کے ذریعے اپنے بندوں کو دیا ہے۔

مَیں نے مذہب کے بیان پر بہت کافی وقت لے لیا ہے۔ اب میں اصل موضوع یعنی تصوّف کی طرف آتا ہوں اور آپ کو بتاتا ہوں کہ انسان کی زندگی پر تصوّف کا کیا اثر پڑتا ہے:

تصوّف کیا ہے؟ یہ ایک علم ہے جس کا موضوع و مقصد ہے ذاتِ باری تعالیٰ کی معرفت و حقیقت۔ صوفیائے کرام اور اولیائے عظام نے تصوّف کی جو تعریفیں کی ہیں وہ مشتمل ہیں تین باتوں پر:

۱۔ تصوّف کا مقصد و معیار اخلاقِ حسنہ میں کمال پیدا کرنا ہے۔

۲۔ تصوّف کا موضوع و مقصد ہے اللہ کی معرفت حاصل کرنا۔

۳۔ تصوّف علم حقائق کا نام ہے۔ یعنی کائنات اور ماورائے کائنات جو کچھ بھی موجود ہے اُس کی حقیقت معلوم کرنا۔ اس میں صرف مادّی اشیاء ہی کا نہیں بلکہ ماورائے سرّیات کا علم بھی شامل ہے۔ مثلاً فرشتے، دوزخ، جنّت، قیامت، حیات بعد الموت اور خود ذاتِ اقدس باری تعالیٰ۔

ان تینوں تعریفوں میں صرف دُوسری تعریف صحیح ہے۔ پہلی تعریف اس لیے درست نہیں کہ تزکیۂ اخلاق بذاتہٖ تصوّف کا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو چند متعدد ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے مقصد و موضوع تک پہنچنے کا۔ حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ:

"تصوّف اور دُوسرے علوم میں یہ فرق ہے کہ اور علوم تو پہلے حاصل کیے جاتے ہیں پھر اُن پر عمل کیا جاتا ہے لیکن تصوّف میں اس کے برعکس۔ پہلے کچھ عمل کرنے پڑتے ہیں پھر علم حاصل ہوتا ہے۔"

تو انہی اعمال میں سے ایک تزکیۂ اخلاق بھی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر تزکیۂ اخلاق نہ کیا جائے تو سالک اپنے مقصود تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ یعنی اُس کو کسی صورت میں بھی معرفت باری تعالیٰ حاصل نہیں ہو سکتی۔

تیسری تعریف اس لیے غلط ہے کہ مادّی اشیار کی حقیقت معلوم کرنا بھی تصوّف کا موضوع و مقصد نہیں ہے۔ یہ چیز بھی معرفت باری تعالیٰ حاصل ہونے پر خود بخود حاصل ہو جاتی ہے۔ تمام صوفیائے کرام کا قول ہے کہ جس کو معرفت باری تعالیٰ حاصل ہو گئی اس کو معرفت الاشیاء بدرجہ اولیٰ حاصل ہو جاتی ہے۔

تصوّف کا مفہوم حاضرہ: یہ تو تھی تصوّف کی تعریف اور اُس کی اصلیت۔ لیکن آج کل دُنیا تصوّف کو جو کچھ سمجھتی ہے وہ کچھ اور ہی چیز ہے۔ اس امر میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ بات سننے کی بہ نسبت دیکھنے سے زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے شہروں سے لیکر چھوٹے چھوٹے دیہات تک آپ کو ہر جگہ کچھ آدمی ایسے نظر آئیں گے جن کو لوگ صوفی یا خدا رسیدہ سمجھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر مادر زاد ننگے رہتے ہیں۔ گالیاں بکتے ہیں اور لوگوں کی خاطر تواضع پتھر اور ڈھیلوں سے کرتے ہیں۔ بھنگ پیتے یا چرس کے دُم لگاتے ہیں۔ نماز روزے کے پاس بھی نہیں جاتے۔ یہ ہیں مسلمانوں کے پیشوا اور ہادی جن کو نہ دین کا پتہ ہے نہ دُنیا کا۔ نہ حرام کو جانتے ہیں نہ حلال کو۔ اب ایک طرف تو اسلام ہے جو طہارت و پاکیزگی کو انسان کا فرضِ اوّلین بتاتا ہے اور اس کے بغیر نماز کو بھی جائز قرار نہیں دیتا۔ اور دُوسری طرف وہ

مسلمان ہیں جو غلاظت و گندگی کے ان مجسموں کو بزرگ اور ولی اللہ مانتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ جس قوم کے ولی اور ہادی ایسے ہوں اس کو دوسری قومیں کیا سمجھتی ہوں گی۔ لوگ ان کو مجذوب سمجھ کر ان کی عزت و خدمت کرتے ہیں۔ لیکن یہ مجذوب نہیں پاگل ہوتے ہیں۔ اصطلاح تصوّف میں مجذوب وہ ہے جس پر اللہ کی محبت یا کسی جلالی صفت کا اس قدر غلبہ ہو کہ حواس ظاہر مغلوب ہو کر استغراق کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

لیکن یاد رکھئے کہ یہ غلبہ کبھی مستقل نہیں ہمیشہ عارضی ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض آدمیوں پر جذب و استغراق کی کیفیت کئی کئی سال طاری رہتی ہے۔ لیکن اس حال میں بھی اُن سے کوئی خلاف شرع قول یا فعل کبھی سرزد نہیں ہوتا۔ عام طور پر نماز کے وقت ان کا استغراق جاتا رہتا ہے یا اتنا کم ہو جاتا ہے کہ پنجگانہ نماز ادا کر لیتے ہیں۔ روزے بھی رکھتے ہیں اور پاک صاف بھی رہتے ہیں۔ کچھ مدّت بعد یہ بالکل ہوش میں آجاتے ہیں۔ جذب و استغراق کا نام بھی نہیں رہتا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ رسول اللہ کی اُمت میں سب سے پہلے مجذوب حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہٗ تھے۔ اب آپ خود فیصلہ کر لیں کہ کہاں تصوّف کا جذب پاکیزہ اور کہاں ان لوگوں کا پاگل پن۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ پاگل ہیں تو ان سے کشف و کرامات کیوں سرزد ہوتی ہیں جن کی وجہ سے دُنیا ان کو بزرگ مانتی ہے۔ اس بات کا جواب میں پچھلے سال کے خطبہ میں بہت وضاحت سے دے چکا ہوں اور خوارقِ عادات کی نفسیاتی وجوہات اچھی طرح سمجھا کر یہ بتا چکا ہوں کہ خوارقِ عادات پاگلوں سے کیوں ظہور میں آتے ہیں۔ یہاں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جن کو دُنیا بزرگ جانتی ہے مثلاً نجومی۔ رمّال۔ پامسٹ،

مسمرائزر۔ ہپناٹسٹ۔ عامل اور ملنگ وغیرہ۔

تو یاد رکھئے۔ ان میں سے کوئی بھی صوفی یا ولی نہیں ہوتا۔ یہ تو سرے سے تصوّف کے طالب علم ہی نہیں ہوتے اور اُن کا مقصود اللہ یا اُس کا عرفان ہرگز نہیں ہوتا۔ صرف دُنیا کمانا ہوتا ہے۔ یہ تو رہے ایک طرف آپ یہ سُن کر حیران رہ جائیں گے کہ متقدمین میں بھی بہت سے بزرگ جنھوں نے تصوّف پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں اور جن کو دُنیا اُن کتابوں کی بنا پر بہت بڑا صوفی سمجھتی ہے۔ کامل صوفی نہ تھے متصوّف تھے۔

حضرت علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ نے بزرگوں کی تین قسمیں لکھی ہیں:

(i) **صوفی**: وہ ہے جو مکمل سلوک طے کر کے درجہ کمال تک پہنچ جائے۔ یعنی اُس کو خدا کا عرفان حاصل ہو جائے۔

(ii) **متصوّف**: وہ ہے جس نے مکمل طور پر سلوک طے نہ کیا ہو۔ آدھا تہائی کیا ہو لیکن عالم و فاضل ہو۔ اور تصوّف پر بڑی بڑی کتابیں پڑھ کر اُن کوائف اور آخری منازل و مقامات سے واقف ہو جائے جہاں تک وہ خود نہیں پہنچا اور جن کا علم خود اُس کو ذاتی طور پر حاصل نہیں ہُوا۔ صرف کتابی علم رکھتا ہے۔

(iii) **مستصوف**: وہ ہے جس نے نہ عملی طور پر سلوک طے کیا نہ تصوّف پر کوئی مستند کتاب پڑھی۔ بس فقیروں کا سا حلیہ بنا لیا اور اِدھر اُدھر کی سُنی سنائی باتیں بنانے اور جہلا کو بہکانے لگا۔

یہ جو دُنیا میں ہزاروں پیر فقیر اور صوفی نظر آتے ہیں اگر آپ مندرجہ بالا تعریفوں کی روشنی میں اُن کو پرکھیں تب بھی شاید ہی معلوم ہو سکے کہ ان میں سے کون کامل اور سچا صوفی ہے، کون ناقص ہے اور کون

بالکل جھوٹا اور مکار ہے۔ حقیقتاً یہ جنس اتنی سستی اور یہ کام اتنا آسان نہیں کہ جس کا دِل چاہے سال دو سال ذکر وغیرہ کر کے سچّا ولی اور کامل صوفی بن جائے۔ لاکھوں آدمی جو اس خیال سے اللہ اللہ شروع کرتے ہیں۔ ان میں سے دو چار ہی آخری منزل تک پہنچتے ہیں۔ ورنہ راستہ ہی میں رُک جاتے ہیں۔ آپ کو پوچھنا چاہیئے کہ جب حال یہ ہے تو پھر ایک کامل صوفی، ایک متصوف اور ایک مستصوف کی خاص پہچان کیا ہے؟

تو سنیئے: ایک کامل صوفی کی پہچان یہ ہے کہ اُس میں کشف و کرامات کی طاقت اور روحانی قوت بھی ہوتی ہے اور ساتھ ہی اُس کا اخلاق، اخلاقِ محمدیؐ کا نمونہ ہوتا ہے۔ وہ شریعت کا سختی سے پابند ہوتا ہے اور اُس کے عقائد بالکل قرآن اور حدیث کے مطابق ہوتے ہیں۔ اُس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کے پاس بدترین گناہگار بھی اصلاح کے لیے آئیں اور اُس کی تعلیم و ہدایات پر عمل کریں تو نیک پارسا اور متقی بن جاتے ہیں۔ مگر بڑی دِقّت یہ ہے کہ اس طرح ایک کامل صوفی اور ایک جعل ساز مستصوف کا فرق تو معلوم ہو سکتا ہے لیکن ایک کامل صوفی اور متصوف میں تمیز کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ تک پہنچنے کے لیے دو عوالم کا سلوک طے کرنا پڑتا ہے۔ پہلے عالم خلق کا اور پھر عالم امر کا۔ عالمِ خلق کی ابتداء ناسوت اور انتہا ھوّ ہے۔ اور عالم امر کی ابتدا عدم اور انتہا ذات باری تعالیٰ ہے۔ جو سالک ذات باری تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے اور اُس کا عرفان حاصل کر لیتا ہے وہ کامل کہلاتا ہے اور جو نیچے کسی مقام تک رہ جاتا ہے وہ خواہ کتنا ہی بڑا بزرگ ہو بہر حال ناقص ہی سمجھا جاتا ہے تو متصوفین میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو عالمِ خلق کے آخری مقام ھوّ تک پہنچ جاتے ہیں لیکن آگے نہیں جا سکتے۔ ان کو

عالمِ خلق کا تو خوب علم ہو جاتا ہے لیکن عالم امر کا ذاتی علم بالکل نہیں ہوتا"۔ یہ علم وہ دُوسرے بزرگوں کی کتابوں سے حاصل کرتے ہیں اور جو کچھ سمجھ میں آتا ہے (حالانکہ غلط سمجھتے ہیں) اُسی کو صحیح سمجھ کر وعظ و نصیحت میں بیان کرتے اور خود اپنی کتابوں میں لکھ دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلاً یونہی جاری رہتا ہے اور جتنا آگے بڑھتا ہے غلطیاں اور غلط فہمیاں اور زیادہ ہوتی جاتی ہیں حتیٰ کہ اغلاط کا یہ طومار جب غیر صوفی عوام تک پہنچتا ہے تو کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ بعض مانے ہوئے بزرگوں کی کتابوں میں ایسے اقوال ملتے ہیں، جو شریعت کے خلاف ہوتے ہیں۔

لہٰذا ایسے اقوال کو ہرگز نہیں ماننا چاہیئے۔ مگر ساتھ ہی نہ تو ان بزرگوں کو بُرا کہنا چاہیے نہ ان کی بزرگی کے متعلق کوئی بدگمانی کرنی چاہیئے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ عالم امر میں صور و اشکال کا ادراک بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہاں کا حال کوئی سالک بیان کرنا چاہے تو بھی نہیں کر سکتا اور اگر کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے الفاظ سے کفر ٹپکنے لگتا ہے۔ اور صحیح مطلب چونکہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کفر بک رہا ہے۔

الغرض ایک سچے صوفی کی شناخت یہ ہے کہ کشف و کرامات اور بے پناہ روحانی طاقت کے باوجود اُس کا کوئی قول اور فعل شریعت کے خلاف نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں اب آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ سچّا تصوف کیا ہے۔ اور جس کو عام لوگ تصوّف سمجھتے ہیں وہ کیا چیز ہے۔ اب اسی سچّے تصوّف کو محور نظر رکھتے ہوئے ہم کو یہ بتانا ہے کہ تصوّف کا انسانی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔

تصوّف کا اثر انسانی زندگی پر: اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے یہ معلوم ہو جانا چاہیئے کہ یہاں انسانی زندگی سے کیا مُراد ہے۔ اس کے

دو مطلب ہو سکتے ہیں - ایک تو یہ کہ انسانی زندگی کی اصل حقیقت کیا ہے - یہ کہاں سے آتی ہے، کہاں جاتی ہے - ازلی و ابدی ہے یا حادث و فانی وغیرہ وغیرہ -

دُوسرا مطلب ہو سکتا ہے - انسان کی روزمرّہ زندگی جو ہم دُنیا میں بسر کرتے ہیں، تو گذارش یہ ہے کہ اگرچہ انسانی زندگی کے ماورائی پہلو پر بھی بہت کچھ کہا اور بتایا جا سکتا ہے لیکن یہ بات ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے - لہذا جو کچھ کہا جائے گا وہ انسان کی روزمرّہ زندگی کی بابت ہو گا - یہ موضوع بھی بہت وسیع اور مشکل ہے، لیکن میں کوشش کروں گا کہ جو کچھ کہوں باوجود انتہائی اختصار کے زیادہ سے زیادہ واضح ہو -

اب مَیں خود ہی ایک سوال کرتا ہوں اور خود ہی اس کا جواب دیتا ہوں - سوال یہ ہے کہ تصوّف ہم کو کیا دیتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ تصوّف ہم کو دُنیا و دین کی اتنی بے شمار اور نایاب نعمتیں دیتا ہے جن کا احاطہ تحریر و تقریر میں نہیں کیا جا سکتا - اس لیے میں اختصار کے خیال سے صرف چند چیزوں کے بیان پر اکتفا کروں گا - وہ چیزیں یہ ہیں :

(۱) علمِ باطن (۲) روحانی طاقت (۳) عقلِ سلیم (۴) قلبِ سلیم

اب ان میں سے ہر ایک کا تھوڑا تھوڑا سا حال سنئے :

علمِ باطن: علمِ باطن یا علمِ سرّیات اُن چیزوں اور طاقتوں کا علم ہے جو حواس ظاہر سے معلوم و متحقق نہیں ہو سکتیں - ان میں وہ چیزیں خاص طور پر شامل ہیں جن پر بِن دیکھے ایمان لانا آسمانی مذاہب کی اساس و بنیاد ہے - مثلاً خدا - فرشتے - آسمانی کتابیں - رسول - قیامت - حقیقت خیر و شر - حیات بعد الموت اور جنّت و دوزخ وغیرہ -

اس علم سے خدا پر ایمان اور دُوسری زندگی میں جزا و سزا ئے اعمال پر یقین اس قدر مستحکم ہو جاتا ہے کہ بال برابر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ لہذا ایسے آدمی سے دنیوی زندگی میں کوئی گناہ یا لغزش نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ صراط المستقیم پر چلتا رہتا ہے۔

یقین تین طرح کا ہوتا ہے :

(۱) علم الیقین (۲) عین الیقین (۳) حق الیقین۔

علم الیقین وہ یقین ہے جو معتبر اور متواتر خبروں یا شہادتوں سے حاصل ہو۔ جیسے کہ خدا۔ قیامت اور حیات بعد الموت کا یقین۔ جو پیغمبروں جیسے سچے اور معتبر گواہوں کے بیان سے پیدا ہوتا ہے۔

عین الیقین وہ ہے جو کسی چیز کو خود آنکھوں سے دیکھ کر حاصل ہو۔ لیکن اس میں بھی یہ ہوتا ہے کہ انسان کو ایک چیز نظر آتی ہے لیکن وہ اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہوتا ؛

حق الیقین یہ ہے کہ انسان جن چیزوں کو جانتا اور دیکھتا ہے اُن کی حقیقت سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ حق الیقین کے معنی ہی "حق یا حقیقت کا یقین" ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جو لوگ کسی دنیوی علم میں کمال حاصل کر لیتے ہیں مثلاً ڈاکٹر، فلاسفر اور سائنسدان، وہ کس قدر دانشور اور عظیم المرتبت ہوتے ہیں۔ بس اسی پر قیاس کر لیجئے کہ جو نفوسِ قدسی علم باطن میں کمال حاصل کر لیں اُن کے مرتبے کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔

اسی باطنی علم میں کشف الغیوب بھی ہے۔ اِن بزرگوں کو یہ بھی بدرجہ اولیٰ میسّر ہوتا ہے۔ وہ کسی آدمی کا گذشتہ یا آئندہ حال معلوم کرنا چاہیں تو سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ باتیں بھی جو خود اُس آدمی کو بھی یاد نہیں

رہیں۔ قرآن میں ہے کہ "ایک ذرّہ برابر خیر و شر بھی جو تم کرتے ہو لکھ لیا جاتا ہے اور قیامت کے دِن تمہارے سب اقوال و اعمال تم کو دکھائے جائیں گے۔" کچھ مدت پہلے عوام کو اس بات کا یقین نہیں آتا تھا لیکن سائنس کی تحقیق ہے کہ دُنیا میں ایک مرتبہ جو حرکت یا آواز پیدا ہوتی ہے وہ ایتھر میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ کبھی بھی فنا نہیں ہو گی۔ اس سے قرآن کی صداقت کا اندازہ کر لیجئے۔ ہاں تو ان کاملینِ تصوّف کو وہ بصیرت و بصارت مل جاتی ہے کہ جس آدمی یا جس واقعہ کا گذشتہ حال معلوم کرنا چاہیں اُس کا یہ اثیری ریکارڈ دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ تو تھا ماضی کا حال۔ اولیائے کرام کو تو مستقبل کے حالات بھی معلوم ہو سکتے ہیں۔ سائنس ابھی تک یہ دریافت نہیں کر سکا کہ جو واقعات آئندہ پیش آنے والے ہیں وہ کہاں سے آتے ہیں اور اُن کا ماخذ کیا ہے لیکن ایک صوفی کامل کو یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ اُس کو خود اپنی تقدیر کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اُس پر فلاں فلاں مصیبتیں آئیں گی اور فلاں فلاں نعمتیں ملیں گی۔ لیکن وہ نہ مصیبتوں سے پریشان ہوتا ہے نہ نعمتوں پر فخر و غرور کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اللہ کی مرضی ہی یوں ہے۔ یہ سب کچھ یونہی ہو کر رہے گا۔ اس لیے وہ تسلیم و رضا کے مسلک پر ثابت قدم ہو جاتا ہے اور اللہ کے اس حکم پر پوری طرح عمل کرتا ہے کہ "اگر تمہاری کوئی چیز تم سے چلی جائے تو اُس کا افسوس نہ کرو۔ اور اگر تم کو کچھ (نعمت) مل جائے تو اس پر ناز مت کرو۔" اس طرح اُس کو استغنائے کامل حاصل ہو جاتا ہے۔ اور دائمی اطمینانِ قلب کی وہ دولت میسّر آجاتی ہے جو دُنیا کے کسی علم سے بھی بدرجۂ کمال میسّر نہیں آسکتی۔

آپ شاید خیال کریں کہ جب ایک صوفیِ کامل آئندہ کا حال معلوم کر لیتا ہے

تو وہ آنے والی مصیبتوں کا قبل از وقت مداوا بھی کر لیتا ہو گا۔ یہ خیال غلط ہے اگر وہ کبھی ایسی کوشش کرتا بھی ہے تو اپنے آپ کو مجبورِ محض اور عاجز پاتا ہے۔ اور خدا کی قدرت وعظمت کا اور بھی زیادہ معترف ہو جاتا ہے۔ وہ تقدیر کو خود نہیں بدل سکتا۔ ہاں! اس کے بدلنے کی دُعا کر سکتا ہے اور اللہ اُس کی خاطر کبھی کبھی تقدیریں بدل بھی دیتا ہے۔

دراصل کشف کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اولیائے کرام کو تمام کائنات کے ذرّے ذرّے کا حال ہر وقت معلوم رہتا ہے۔ جیسا کہ جاہل لوگ سمجھتے ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ کشف میں تو صرف وہی حال معلوم ہوتا ہے جو کوئی بزرگ جاننا چاہے یا خود اللہ تعالےٰ کسی مصلحت سے اس کو بتانا چاہے۔ باقی باتوں کے متعلق تو وہ بھی ایسے ہی اندھیرے میں رہتا ہے جیسے کہ عام آدمی۔

الغرض! یہ ہیں علمِ باطن کی برکتیں اور ان کا اثر جو ایک صوفی کی زندگی پر پڑتا ہے اور جو اُس کو دوسرے عوام وخواص سے ممتاز و افضل بنا دیتا ہے۔

روحانی طاقت: دُنیا میں طاقت سب سے بڑی نعمت اور کمزوری سب سے بڑی لعنت ہے۔ طاقت دو قسم کی ہوتی ہے مادّی اور روحانی۔ مادّی طاقت مشتمل ہے۔ جسمانی۔ علمی۔ عقلی اور دولت کی طاقتوں پر۔ اس وقت دُنیا میں جو چہل پہل اور ترقی نظر آتی ہے یہ سب انہی چار طاقتوں کی مشترکہ مساعی کی وجہ سے ہے۔ مادّی طاقت کے کرشمے آنکھوں سے نظر آتے ہیں اس لیے اس کو سب جانتے ہیں۔ لیکن روحانی طاقت کا اظہار کرامات وخوارق کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس لیے بہت سے لوگ اس کو نہیں مانتے۔

افسوس یہ ہے کہ جب ہم اولیاء اور صوفیا کی کرامات کا ذکر کرتے ہیں تو یہ

لوگ ناک بھوں چڑھاتے اور مذاق اُڑاتے ہیں۔ لیکن جب ہم مسمریزم اور ہپناٹزم کا حوالہ دیتے ہیں تو اُس کو مان لیتے ہیں۔ جب مسمریزم اور ہپناٹزم سے بیماریوں کے علاج کا ذکر آتا ہے یا یورپ و امریکہ کی روحانی مجلسوں میں روحوں کو بلاتے اور ان سے کام لینے کے قصّے بیان کیے جاتے ہیں تو تسلیم کر لیتے ہیں لیکن جب حاضرات اور عملیات یا دَم وغیرہ کے ذریعے امراض کے علاج کا حال کہا جاتا ہے تو ہنسی اُڑاتے ہیں۔ یہ سب ہٹ دھرمی نہیں تو کیا ہے۔

معمولی روحانی کرشمے تو ہمارے فقیر اور عامل دِن رات دکھاتے رہتے ہیں لیکن کامل بزرگوں کی کرامات کچھ اور چیز ہے۔ روحانی طاقت سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کے ذریعہ سے مہلک بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے جیسے کہ ہپناٹزم سے ہوتا ہے۔ ہمارے کاملین اپنی قوت خیال کا اثر ڈال کر لوگوں کو ایسے نظارے دکھا سکتے ہیں جن کا وجود ہی نہیں ہوتا (یہ چیز سیمیا کہلاتی ہے) ہزاروں میل کے فاصلہ پر روحانی پیغام بھیج کر اپنے کسی معتقد سے اس پر عمل کرا سکتے ہیں۔ (یہ ٹیلی پیتھی کہلاتی ہے) موجود چیزوں کو ناظرین کی نظر سے غائب کر دیتے ہیں حالانکہ وہ وہیں ہوتی ہیں۔ خود بھی اسی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ اپنے گھر بیٹھے بیٹھے ہزاروں میل کے فاصلہ پر دوستوں سے جسمانی ملاقات کر لیتے ہیں۔ چشم زدن میں ایک مقام سے ہزاروں میل دُور مع جسم کے پہنچ جاتے ہیں۔ آگ پر چل سکتے ہیں۔ ہوا میں اُڑ سکتے ہیں۔ پانی پر دوڑ سکتے ہیں۔ مادّے کے پار گذر جاتے ہیں۔ برسوں زمین میں دفن رہنے کے بعد زندہ نکل آتے ہیں۔ مٹی کو ہاتھ لگا کر سونا بنا دیتے ہیں۔ مُردے زندہ کر سکتے ہیں۔ دوزخ اور جنّت میں پہنچ کر وہاں کی سیر کر آتے ہیں بلکہ عرش تک پہنچ جاتے ہیں۔

الغرض روحانی طاقت سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ

یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ واقعی کامل ہوتے ہیں اُن میں اگرچہ یہ سب کچھ کرنے کی طاقت موجود ہوتی ہے۔ لیکن وہ ان سب باتوں کو تضیع اوقات اور حرکات طفلانہ سمجھ کر کچھ بھی نہیں کرتے۔ ہاں اگر اللہ کا حکم ہو تو پھر سب کچھ کر گذرتے ہیں۔ آپ کو پوچھنا چاہیئے کہ کامل صوفیوں کے علاوہ اور لوگ جو خوارق دکھاتے ہیں تو کیا وہ اللہ کے حکم کے بغیر خود اپنی مرضی اور اختیار سے ہی ایسا کرتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ اِن لوگوں کی روحانی طاقت بہت معمولی قسم کی ہوتی ہے جو چند قسم کی مقررہ پریکٹسوں سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اِس کو حاصل کر لینے کے بعد وہ مختار ہیں کہ جب چاہیں دکھائیں۔ ان لوگوں کا مقصد ذاتی نفع۔ نام نمود اور شہرت ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں بطور پیشے اور فن کے اپنے ذاتی فائدے کے لیے کرتے ہیں محض خدا کے لیے نہیں کرتے۔ صوفیائے عظام بھی اپنی مرضی سے جب چاہیں کرامت دکھا سکتے ہیں۔ لیکن اُن کو مشیّتِ الٰہی کا پتہ ہوتا ہے اور جہاں مشیّتِ ایزدی اُن کی خواہش کے خلاف ہوتی ہے۔ وہاں یا تو وہ کرامت دکھانے کا ارادہ ہی ترک کر دیتے ہیں یا خدا سے اِذن طلب کرتے ہیں۔

اللہ چاہتا ہے تو اُن کی خاطر اپنی مشیّت کو بدل دیتا ہے اور وہ کرامت دکھا دیتے ہیں ورنہ نہیں دکھاتے۔ ابتدائے سلوک ہی سے صوفیائے کرام کا مقصود اللہ تک رسائی ہوتا ہے کرامتوں کی قوت پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ یہ ساری طاقتیں تو ان کو سلوک طے کرتے ہوئے خود بخود مل جاتی ہیں۔ اس لیے ان کے دل میں اِن کی کوئی قدر بھی نہیں ہوتی۔

دُوسری بات یہ ہے کہ جب یہ طاقتیں اُن میں پیدا ہو جاتی ہیں تو اگر وہ ان کے کرشمے دیکھنے دکھانے ہی میں لگ جائیں تو اللہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور

جب وہ اللہ تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر یہی طاقتیں اور کرامات ان کو بچوں کا کھیل نظر آتی ہیں۔ اُن کو تو وہ کچھ ملتا ہے جس کے مقابلہ میں یہ چیزیں اتنی بھی وقعت نہیں رکھتیں جتنی ایک گھاس کا تنکا۔

اس میں شک نہیں کہ اولیائے کرام کی توجّہ اور دُعا سے لوگوں کو ہر طرح کے فائدے پہنچتے اور بہت سے بگڑے ہوئے کام بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ بزرگ اِن انفرادی فوائد کی طرف زیادہ توجّہ نہیں دیتے۔ اصل کام جو وہ اس طاقت سے لیتے ہیں وہ تو اجتماعی اصلاح ہے اور یہ صحیح معنوں میں بنی نوعِ انسان کی سب سے بڑی خدمت ہی ہے۔ تمام پیغمبر بھی اسی غرض سے بھیجے گئے تھے۔ انفرادی طور پر لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے نہیں بھیجے گئے۔ ہمارے آقائے محترم رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم جب تشریف لائے تو سارا عرب جہالت، جدال و قتال اور مفلسی کے گھنگھور طوفانوں میں گھرا ہُوا تھا۔ مگر حضورؐ نے اُن کا افلاس دُور کرنے کے لیے نہ تو پارس پتھری دی۔ نہ کیمیا کا نسخہ بتایا۔ نہ دستِ غیب کا عمل سکھایا (ہاں کبھی کبھی کاروباری مشورے ضرور دیتے) بلکہ اجتماعی طور پر سارے ملک کی اصلاح کے لیے اہلِ عرب کو خدا اور اس کے قانون سے روشناس کرایا۔ اور عمر بھر ناقابلِ بیان تکلیفیں اُٹھا کر منوا دیا کہ ہاں خدا موجود ہے اور اُس کا قانون سچا ہے۔ اور جب اُنہوں نے اس قانون پر عمل درآمد شروع کر دیا تو ساری دُنیا نے دیکھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں سارے عرب کی کایا پلٹ گئی۔ وہی عرب جو جاہل تھا مہذب بن گیا۔ جدال و قتال کی جگہ محبت خلوص اور پریم نے لے لی۔ اور افلاس کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ تیس برس کے قلیل عرصہ میں اہلِ عرب کے پاس قیصر و کسریٰ کے خزانے جمع ہو گئے اور کوئی بھی مفلس نہ رہا۔

اب آپ خود فیصلہ کرلیں کہ روحانی طاقت والوں کے لیے انفرادی طور پر لوگوں کی خدمت کرنا زیادہ وقیع اور اہم ہے یا اجتماعی طور پر ان کی تہذیب و اصلاح کی کوشش۔

اب آپ شاید یہ سوال کریں کہ اصلاح تو ہمارے علمائے ظاہر بلکہ دنیاوی لیڈر اور ریفارمر بھی کرسکتے ہیں۔ اس کے لیے روحانیت اور اہلِ روحانیت ہی کی کیا خاص ضرورت ہے؟ تو میں کہوں گا کہ معاف فرمائیے آپ کا یہ سوال روحانیت سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ ایک تار جس میں بجلی نہ ہو ہرگز وہ کام نہیں کرسکتا جو بجلی سے بھرا ہوا ایک "لِوِنگ وائر" کرسکتا ہے۔ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ یہ اگر ممکن ہوتا تو آج دنیائے اسلام کو اصلاح کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ سنئیے میں نے ابھی لِونگ وائر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس تار میں بجلی دوڑ رہی ہو اُس کو "لِونگ وائر" کہتے ہیں۔ اس کے لفظی معنے ہیں "زندہ تار"۔ اہلِ روحانیت بھی ایک زندہ تار کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کی رگ رگ میں ایک ایسی برقی قوت اور مقناطیسی کشش ہوتی ہے کہ آدمی خواہ مخواہ اُن سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اُس پر عمل کرنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں اور بہت جلد نیک اور اچھے شہری بن جاتے ہیں۔ دُوسرے یہ کہ اِن بزرگوں میں یہ طاقت بھی ہوتی ہے کہ جو آدمی کہنا نہ مانے یا کوئی بُری عادت نہ چھوڑے اُس پر متواتر توجّہ کرکے وہ عادت چھڑا دیتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ ان کا اخلاق، اخلاق محمدیؐ کا نمونہ ہوتا ہے۔ اور جو کوئی ان کی صحبت میں رہتا ہے ویسا ہی بن جاتا ہے۔ میرے خیال میں روحانی طاقت کا بیان اُمید سے زیادہ لمبا ہوگیا۔ اب ہم کو عقلِ سلیم کا ذکر کرنا چاہیئے۔

عقلِ سلیم: خدا کی عطا کردہ بے شمار نعمتوں میں عقل بھی ایک بڑی نعمت ہے اور انسان وحشت اور بربریت کی زندگی سے تہذیب و تمدن کی موجودہ بلندیوں تک اسی کی مدد سے پہنچا ہے۔ عقل نے اُس کو اِس مقام تک جس طرح پہنچایا وہ بہت ہی دلچسپ اور بصیرت افروز داستان ہے مگر اس چھوٹے سے خطبہ اور محدود وقت میں کہاں بیان ہوسکتی ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ انسان نے اپنی پیدائش سے آج تک سفرِ ہستی کا جتنا راستہ طے کیا ہے اُس میں عقل نے ایک لمحہ بھی اُس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ سارا راستہ انگلی پکڑ کر پاؤں پاؤں چلایا۔ اور ہر ہر قدم پر بتایا کہ اس ماحول میں جتنی چیزیں بھری پڑی ہیں ان میں سے یہ تیرے لیے مفید ہیں اور یہ مُضر۔ یہ حیات آفریں ہیں اور یہ مہلک۔ یہ عقل ہی ہے جس نے ماکولات و مشروبات میں مفید و مُضر اشیاء کا نہ صرف تعیّن کیا بلکہ اُن کی مضرت اور افادیت کے درجات بھی مقرر کیے۔ یہ عقل ہی ہے جس نے ملبوسات و مکانات میں ہر ماحول اور آب و ہوا کے مطابق طرح طرح کی ایجاد و اختراع کر کے اُن کو انسان کے لیے آرام دہ بنایا۔ یہ عقل ہی ہے جس نے زراعت، تجارت اور بار برداری کے نئے سے نئے وسیلے ایجاد کیے اور انسان کو آبادیوں میں مل جل کر رہنے کے طور طریقے سکھائے۔

الغرض عقل ہی نے انسان کو پالا پوسا اور بڑا کیا۔ اور آج بھی جبکہ وہ عنفوانِ شباب کے آستاں پر قدم رکھ چکا ہے اس دایۂ مہربان نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ آج بھی انسان کی انگلی اُسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ آسمانی سفر کی تیاری کر رہا ہے۔

عقل کے دو مدارج ہیں۔ پہلا عقلِ صمیم اور دوسرا عقلِ سلیم۔ اب تک

جو کچھ بھی عقل نے کیا وہ اس سطح زمین پر مادّی اسباب و وسائل کے ذریعہ انسان کی بقا اور ترقی کے لیے تھا۔ اور یہ سب کام تھا عقل صمیم کا، لیکن انسان صرف گوشت پوست اور ہڈیوں کے ڈھانچے ہی کا نام نہیں۔ اُس کے خمیر میں مادّی اجزاء کے علاوہ کچھ غیر مادّی عناصر بھی شامل ہیں۔ اور مادّی احتیاجات و خواہشات کے علاوہ اُس کے کچھ مابعد الطبیعاتی تقاضے اور ماورائی تمنائیں بھی ہیں۔ ان تقاضوں کو پُورا کرنا اور ان تمناؤں کے حصول میں مدد دینا عقل سلیم کا کام ہے۔ یہ تقاضے اور تمنائیں بہت سے ہیں۔ یہاں صرف دو بنیادی چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اوّل یہ کہ ہر انسان بلا استثنا یہ چاہتا ہے کہ اسے اطمینانِ قلب نصیب ہو۔ رنج والم اس کے نزدیک بھی نہ آئے اور وہ ہمیشہ خوشی اور مسرّت کی زندگی بسر کرے۔

دوم یہ کہ انہی انسانوں میں کوئی کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو ہر وقت ہر شے اور ہر بات کی کنہ اور حقیقت معلوم کرنے کے درپے رہتا ہے اور اس کے دل میں ہر وقت یہ آوازیں اُٹھتی ہیں :

مَیں کون ہوں ؟ کہاں سے آیا ہوں ؟ کہاں جاؤں گا ؟ میرے آنے کا مقصد کیا ہے ؟ یہ کائنات کیا ہے ؟ اس کا بنانے والا کوئی ہے یا نہیں ہے ؟ ہے تو وہ کہاں ہے کیسا ہے اور اپنی مخلوق سے اُس کا تعلق کس طرح قائم ہے ؟ وغیرہ وغیرہ۔

ان میں سے شق اوّل کے لیے ایک ایسے نظام اخلاق کی ضرورت ہے۔ جس کا پابند رہ کر انسان امن وامان کی زندگی بسر کر سکے۔ یہ نظام اخلاق کیا چیز ہے اور اُس کی غرض وغایت کیا ہے ؟

سنیئے: دُنیا میں کوئی آدمی بھی تنہا زندگی بسر نہیں کرسکتا ہر شخص مجبور ہے کہ احتیاجات زندگی کے حصول اور جذبات کی تسکین کے لیے دُوسروں سے مدد لے اور میل جول پیدا کرے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی امر واقعہ ہے۔ کہ ہر انسان کی طبیعت فطرتاً اور تربیتاً دُوسروں سے کسی نہ کسی قدر مختلف اور بعض اوقات بالکل متضاد ہوتی ہے۔ اس واسطے جب وہ آپس میں ملتے ہیں تو تصادم ہو جاتا ہے۔ جس سے عناد فساد اور لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور بعض اوقات نوبت قتل و غارت تک پہنچتی ہے۔ یہ چیز نوع انسان کی فلاح و بہبود اور ترقی و بقاء کے لیے سم قاتل ہے۔ اس لیے ناگزیر ہُوا کہ کوئی ایسا طریقہ اور راستہ دریافت کیا جائے کہ یہ اختلافات اور فتنہ و فساد بالکل ختم نہ ہو سکیں تو اس حد تک کم ضرور ہو جائیں کہ تخریب و تباہی کا خوف جاتا رہے۔ یہ اُس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک کہ انسانی افعال و اعمال اور تخیلات میں زیادہ سے زیادہ یکسانیت نہ پیدا ہو۔ اس موقعہ پر جب فکر عاجز ہونے لگی تو عقل سلیم نے آگے بڑھ کر دستگیری کی اور انسان کے تمام اعمال و افعال اور تخیلات بلکہ حرکت و سکون تک سب کو دو حصّوں میں بانٹ دیا۔ اور بتلایا کہ دیکھو حصّہ اوّل میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب خیر کہلاتی ہیں اور حصّہ دوم میں جو کچھ ہے اُس کو شر کہتے ہیں۔ جو چیزیں خیر ہیں وہ انسان کی ترقی و تعمیر۔ بقاء و بہبود۔ خوشی و خوش حالی اور اطمینان و سکون کا موجب ہوتی ہیں۔ اور جتنی چیزیں شر ہیں وہ تنزل و تخریب۔ ہلاکت و تباہی و فلاکت و افلاس اور انتشار و الم کا سبب بن جاتی ہیں۔ اِس لیے خیر کو اختیار کرو اور شر سے بچو۔ اگر تم میرا کہنا مانو گے تو قیامت تک پھولو پھلو گے اور خدا کی لامحدود

نعمتوں سے متمتع ہو گے۔ نہ مانو گے تو فنا ہو جاؤ گے اور فنا نہ بھی ہو تو وحشت و بربریت کی زندگی بسر کرو گے۔ چنانچہ جن قوموں نے عقل سلیم کے مشورہ پر جتنا زیادہ عمل کیا وہ دُوسری قوموں سے اتنی ہی زیادہ معزز و مفتخر ہوئیں اور آسائش و آرام سے رہیں۔ جنہوں نے نہ مانا وہ خراب و خوار ہوئیں اور آج تک ہیں۔ یقین نہ آئے تو وحشی قبائل کی حالت دیکھ لو۔

غور کرو تو یہ نظامِ اخلاق وہی قانونِ الٰہی ہے جو مذہب پیش کرتا ہے۔ عقلِ سلیم کا کام نظامِ اخلاق کی تدوین پر ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ ہمیشہ دو بہت ہی اہم امور میں مصروف رہتی ہے۔

دُوسری شق میں جتنے بھی امور ہیں وہ سب مابعد الطبیعاتی اور ماورائی ہیں۔ اس راہ کا مسافر تو عقلِ سلیم کی مدد بغیر دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔ مگر اس میدان میں عقلِ سلیم آخری منزل تک سالک کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ تاہم وہ اُس کو صراط المستقیم پر ڈال کر ایک ایسے آستانِ قدسی تک پہنچا دیتی ہے۔ جس میں داخل ہونے کے بعد ہر مشکل آسان اور ہر راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اُس کا کام اور فلسفہ کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔ وہ یہاں سے ایک قدم بھی آگے نہیں جا سکتی اور بے اختیار پکار اُٹھتی ہے۔ ؎

اگر یک سرِ موئے برتر پرم فروغِ تجلی بسوزد پرم

اس آستاں سے آگے کا راستہ قلبِ سلیم کی معیت و رہنمائی میں طے ہوتا ہے مگر وہ بھی آخری منزل تک ساتھ نہیں دے سکتا۔ راستے ہی میں تھک کر بیٹھ جاتا ہے پھر کیا ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے کسی زبان میں بھی کوئی لفظ نہیں ہے لہٰذا خموشی ہی آخری جواب ہے۔

قلبِ سلیم: چوتھی نعمت جو تصوّف کی بدولت انسان کو ملتی ہے اور

جو انسان کو فرشتوں سے بھی افضل بنا دیتی ہے، قلب سلیم ہے۔ قلب سلیم سے انسان کو کیا کیا ملتا ہے، یہ الفاظ میں نہیں بتایا جا سکتا صرف کر کے دیکھنے سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ تاہم اتنا بتایا جا سکتا ہے کہ مدت دراز تک عبادت مجاہدہ۔ تزکیۂ اخلاق اور ذکر و فکر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سالک کا قلبی تعلق ساری دنیا سے قطع ہو کر صرف اللہ سے قائم ہو جاتا ہے۔ یعنی بمصداق "وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًاؕ" وہ سب کو چھوڑ کر اللہ کا ہو رہتا ہے۔ اللہ سے اس کی قوی نسبت قائم ہو جاتی ہے۔ ہر امر میں اس کو اللہ سے براہِ راست ہدایت ملنے لگتی ہے اور وہ خیر و شر کی پہچان اور اپنے حقوق کی بجا آوری میں کبھی غلطی نہیں کرتا۔ دنیا کے جتنے انفرادی یا اجتماعی مسائل اسے پیش آتے ہیں۔ سب کو کماحقہٗ سمجھتا اور ہمیشہ صحیح فیصلہ کرتا ہے۔ جتنے آدمی اس سے ملتے ہیں ان میں سے جو ملنے کے قابل نہیں ہوتے اس کا دل ان کی طرف کبھی مائل نہیں ہوتا۔ باوجود اس کے وہ ان سے بھی بڑے پیار اور اخلاق سے ملتا ہے اور جو خدمت ممکن ہو اس سے گریز نہیں کرتا۔ قلب سلیم کی برکتیں کہاں تک گنوائی جائیں مختصر یہ ہے کہ صاحب قلب سلیم براہِ راست اللہ کی نگرانی اور حفاظت میں آجاتا ہے اور ہر قسم کے مضرات و مہلکات سے بچا رہتا ہے۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ایسے آدمی کا دنیا اور امور دنیوی سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں رہتا۔ وہ دنیا کے سارے کام اسی طرح کرتا ہے جیسے ایک غیر صوفی اور عام نیک آدمی کرتا ہے۔ یہ بھی نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کو کسی رنجدہ بات کا رنج اور خوش کن بات کی خوشی نہیں ہوتی۔ یا غریبوں، بیماروں اور بے کس و لاچار آدمیوں کو دیکھ کر اس کا دل نہیں دکھتا۔

۔ لیکن کوئی تاثر بھی دو چار منٹ سے زیادہ نہیں رہنے پاتا اور اس قلیل عرصہ میں بھی وہ خدا سے غافل نہیں رہتا ۔ اُس کی حالت بالکل حرف مشدّد کی سی ہوتی ہے کہ ایک طرف مخلوق میں شامل ہوتا ہے تو دُوسری طرف اللہ سے واصل رہتا ہے ۔ کیا اِس سے زیادہ نعمت ایک انسان کے لیے اور بھی کوئی ہوسکتی ہے
آئیے اب دُعا کریں کہ اللہ ہم سب کو ایسا ہی قلب سلیم عطا فرمائے ۔
آمین یا رب العٰلمین ۔

لاہور
۱۰ اپریل ۱۹۶۴ء

خادم الخدام
عبدالحکیم انصاری

اللہ تبارک تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہم سب کو ایک سال بعد پھر اکھٹے ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔ ہماری صحت اچھی رکھی۔ زندگی دی اور اپنے راستہ پر ہماری طلب کو پہلے سے زیادہ ترقی بخشی۔ اس کے بعد اہلِ حلقہ لاہور خصوصاً جناب محمد علی صاحب۔ محمد قاسم صاحب اور چوہدری جلال الدین صاحب کا شکریہ بھی اپنی اور آپ سب کی طرف سے ادا کرتا ہوں۔ محمد علی صاحب نے اس مرتبہ پھر اجتماع کا پورا بار خود اٹھایا ہے۔ اللہ تعالےٰ ان کو اس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ دولت اور صحت دے اور مزید نیکیوں کی توفیق بخشے۔ قاسم صاحب اور چوہدری جلال الدین صاحب نے حسبِ دستور اپنی کاروباری مصروفیتوں کو نظر انداز کر کے اجتماع کے انتظام و انصرام میں اپنے وقتِ عزیز کا بیشتر حصہ صرف کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی تمام دِلی مُرادیں بر لائے۔ آمین

آخر میں ان تمام دوستوں کا دِلی شکریہ ادا کرتا ہوں جو دُور دراز مقامات سے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے تشریف لائے اور جلسہ کی رونق و کامیابی کا باعث ہوئے۔

برادرانِ حلقہ! اس خوشی و مسرّت کے موقعہ پر میں آپ کو ایک بہت ہی اندوہناک واقعہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ گذشتہ سال کے دوران ہمارے ایک بہت ہی عزیز بھائی کو موت کے ظالم پنجے نے ہمیشہ کے لیے ہم سے جُدا کر دیا۔ میری مُراد مرحوم و مغفور سارجنٹ محمد سلیمان صاحب سے ہے جنہوں نے کچھ ماہ ہُوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم نے ایک بوڑھی ماں اور بھائی بہنوں کے علاوہ اپنے پیچھے ایک بیوہ اور ایک شیر خوار بچّہ چھوڑا ہے۔ اللہ تبارک و تعالےٰ سے دُعا ہے کہ وُہ خود ان سب کی دستگیری و سرپرستی فرمائے اور مرحوم کو اپنا قربِ عطا کرے۔ آمین

مرحوم بہت بڑی خوبیوں اور نہایت ہی اعلیٰ کردار کے انسان تھے۔ بہت تھوڑے عرصہ میں بہت نمایاں روحانی ترقی کی تھی۔ اگر زندہ رہتے تو ہمارے حلقہ کے لیے نہایت قابلِ فخر ثابت ہوتے۔

مرحوم کے علاوہ حلقہ کے اور کئی بھائیوں کے والدین اور قریبی رشتہ دار بھی اس سال اللہ کو پیارے ہُوئے۔ مَیں اپنی اور تمام اہلِ حلقہ کی طرف سے ان سب کی وفات پر اظہارِ تعزیت و ہمدردی کرتا ہوں اور اللہ سے دُعا کرتا ہوں کہ ان سب کو جنّت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

آیئے اب ہم سب ان کے لیے دُعائے مغفرت کریں۔

برادرانِ حلقہ! پچھلے تین سال کے خطبات میں مَیں نے آپ کو بتایا تھا کہ قرآن میں جس تصوّف کا ذکر آیا ہے اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس تصوّف کی تعلیم دی ہے وہ کیا تھا۔ لیکن مرورِ ایام سے رفتہ رفتہ

کیا سے کیا بن گیا۔ انہی خطبات میں آپ کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تصوّف کا مقصد حصول کشف و کرامات ہر گز نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر لوگ خیال کرتے ہیں بلکہ تصوّف کا مقصد تو ذات باری تعالیٰ کا قرب و عرفان ہے۔ آج کے خطبے میں مَیں یہ بیان کروں گا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے طریقے کیا ہیں۔ یعنی باری تعالےٰ کا قرب و عرفان کس طرح میسّر آسکتا ہے۔

یہ بات ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس طرح ہر علم کا کوئی خاص مقصد ہوتا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے چند متعین طریقے ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح تصوّف کے مقصد یعنی ذات باری تعالیٰ کا قرب و عرفان حاصل کرنے کے بھی چند خاص طریقے ہیں۔ ان طریقوں پر عمل کرنے کو "سلوک" کہتے ہیں۔ تصوّف دُوسرے مذاہب میں بھی ہے لیکن ان کا سلوک اس قدر مشکل ہے کہ اگر کوئی اس پر پُوری طرح عمل کرے تو دُنیا کا کام کرکے اپنی اور بال بچوں کی ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام مذاہب میں دُنیا

کو چھوڑے بغیر کام نہیں بنتا۔ مذہبِ اسلام کا سلوک ایسا نہیں ہے اس میں سالک دُنیا کے سارے کام بوجہ احسن کرتے ہوئے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ قاعدے نہایت ہی سادہ اور سہل العمل ہیں۔ مگر سب سے پہلی اور ضروری بات یہ ہے کہ سلوک شروع کرتے وقت انسان اچھا مسلمان ہو، یعنی اس کے عقائد، عبادات اور اعمال قرآن کے مطابق ہوں۔ وہ نماز روزے وغیرہ کا پابند ہو، حقوق اللہ اور حقوق العباد کو اچھی طرح پُورا کرتا ہو، کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو اور اس کا اخلاق اسلامی تعلیم کے معیار پر پُورا اترتا ہو،

اگر کسی شخص میں یہ سب باتیں نہیں ہیں تو پہلے اس کو ایک اچھا اور پکّا مسلمان بننا چاہیئے اور پھر سلوک شروع کرنا چاہیئے۔

بات دراصل یہ ہے کہ صرف نماز روزہ وغیرہ کی ادائیگی اور امر و نہی کی پابندی سے آدمی پکا مسلمان تو ضرور بن جاتا ہے لیکن ولی اللہ نہیں بن سکتا۔ ورنہ جتنے بھی نمازی مسلمان ہیں آج یہ سب ولی اللہ ہوتے۔ ولی اللہ بننے کے لیے کچھ اور اونچے درجہ کی عبادت اور تزکیۂ اخلاق کی بہت ضرورت ہے۔ ایک مرتبہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں کچھ اعرابی مسلمان ہونے کے لیے حاضر ہوئے۔ جب حضور نے ان کو مسلمان کر لیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ مبارک ہو ہم ایمان لے آئے۔ اس پر حضور اکرمؐ پر وحی نازل ہوئی کہ

قالت الاعراب اٰمنّا ط قل لم تؤمنوا ولٰکن قولوآ اسلمنا لما یدخل الایمان فی قلوبکم

یعنی "اعرابی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ ان سے کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں۔ ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل بھی نہیں ہوا"۔ اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ پہلے آدمی مسلمان بنتا ہے۔ پھر اس سے آگے ترقی کر کے مومن بنتا ہے۔ اور پھر اس سے بھی زیادہ ترقی کر کے مرتبۂ احسان پر فائز ہوتا ہے۔ یعنی ولی اللہ بن جاتا ہے۔ مومن کی پہچان حضور رسول کریمؐ نے یہ بتائی ہے کہ جب وہ عبادت کرے تو یوں محسوس کرتا ہے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے اور مرتبۂ احسان کی پہچان یہ بتائی ہے کہ جب وہ عبادت کرے تو یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔ اس حدیث اور متذکرہ صدر آیت سے یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ ولی اللہ بننے کے لیے انسان کو پہلے پکّا مسلمان بننا چاہیئے۔ اس کے بعد

ہی وہ مومن اور آخر میں ولی کامل بن سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ احباب حلقہ بیعت ہونے کے بعد عبادات اور شریعت کے دوسرے احکام پر اچھی طرح عمل کریں۔ جو لوگ ایسا نہیں کریں گے وہ اپنا مقصد حاصل نہ کر سکیں گے۔ البتہ جو لوگ پہلے ہی سے عبادت و شریعت کے پابند ہوں گے وہ بیعت ہونے کے بعد سلوک کے طریقوں پر عمل کر کے بہت جلد کامیابی حاصل کر سکیں گے۔

اسلامی سلوک میں کوئی دِقّت یا پیچیدگی مطلق نہیں۔ بلکہ جس طرح اسلام ایک سیدھا اور آسان مذہب ہے اسی طرح اسلام کا سلوک بھی بالکل سادہ اور آسان ہے۔ اس میں دوسرے مذاہب کی طرح نہ تو ترک دنیا لازمی ہے نہ ایسے سخت مجاہدے اور ریاضتیں ہیں جن سے جسم اور نفس کو اذیت پہنچے۔ اس سلوک کے صرف دو حصّے ہیں ایک تو ذکر دوسرے تزکیۂ اخلاق ذکر میں نماز اور تلاوتِ قرآن بھی شامل ہے لیکن یہ دونوں چیزیں تو ہر مسلمان کرتا ہی ہے۔ سالک کو ان کے علاوہ کچھ اور ذکر بھی کرنا پڑتا ہے۔ وہ ذکر دو طرح کا ہے ایک "پاس انفاس" دوسرا "نفی اثبات"۔ ان دونوں اذکار کی اصل قرآن مجید اور احادیث رسول ؐ سے اخذ کی گئی ہے۔

پاس انفاس تو یہ ہے کہ جب آپ کا دماغ دنیوی امور سے خالی ہو اس وقت ہر سانس سے لفظ اللہ دِل میں کہیں۔ نفی اثبات کلمۂ طیبہ کا ذکر ہے۔ اس کا طریقہ آپ سب جانتے ہیں اس لیے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

الغرض ان دونوں اذکار میں کوئی بھی ایسا نہیں جو قرآن یا حدیث کے خلاف ہو۔

اسلامی سلوک کی ابتدا اور انتہا اللہ تبارک تعالےٰ نے سورۂ مزمل کی ایک چھوٹی سی آیت میں بیان کردی ہے۔ فرماتے ہیں:

واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا۔ یعنی "اپنے رب کے نام کا ذکر کرو اور سب کو چھوڑ کر اللہ کے ہو جاؤ۔" ظاہر ہے کہ رب ایک صفاتی نام ہے۔ ذاتی نام باری تعالےٰ کا اللہ ہے تو مطلب یہ ہوا کہ لفظ اللہ کا ذکر کیا کرو۔ یہ ذکر کس طرح کیا جائے۔ اس کا طریقہ بھی اللہ تعالےٰ نے خود ہی بتایا ہے۔ فرمایا ہے:

واذکر ربک فی نفسک تضرعاً وّخیفۃً وّدون الجہر من القول بالغدو والاصال ولا تکن من الغافلین۔ یعنی "اور اپنے رب کو دل میں یاد کرو زاری اور ڈر سے زبان سے آواز نکالے بغیر صبح اور شام اور غافلوں میں سے نہ ہونا۔" دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

واذا قضیتم الصلوٰۃ فاذکروا اللہ قیاماً وّقعوداً وّعلیٰ جنوبھم۔ یعنی "اور جب تم نماز ختم کر چکو تو اللہ کو یاد کیا کرو۔ اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے۔" ذکر کے متعلق جو اور آیات قرآن مجید میں ہیں اُن کو اور اِن دو آیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اولیائے کرام نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ اللہ تبارک وتعالےٰ کو چوبیس گھنٹے برابر ہی یاد رکھنا چاہیئے اور اس کی یاد سے غفلت کبھی نہیں کرنی چاہیئے۔

اب چونکہ ہر کام کا ایک مناسب قاعدہ ہوتا ہے اِس لیے انہوں نے اللہ کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کے لیے پاس انفاس کا طریقہ ایجاد کیا۔ یعنی ہر سانس سے جو باہر نکلے یا اندر آئے لفظ اللہ دِل میں کہا جائے آواز نکالے بغیر مگر بے خیالی اور بے پروائی سے نہیں بلکہ جب

بھی دِل اللہ کہے تو محبت کے ساتھ اللہ کا خیال بھی دِل میں آئے۔ درحقیقت اس سے بہتر اور کوئی طریقہ اللہ کو ہر وقت یاد رکھنے کا ہے بھی نہیں۔ عام طور پر جس چیز یا جس بات کو یاد رکھنا ہو اس کو کسی ریفرنس یعنی حوالہ یا وسیلہ سے زیادہ آسانی کے ساتھ یاد رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ دِن کے چوبیس گھنٹوں میں اس کا ماحول اور کیفیات تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد برابر بدلتی رہتی ہیں۔ ابھی آپ گھر میں تھے تو کچھ دیر بعد آپ دفتر میں پہنچ گئے۔ پھر کچھ دیر بعد آپ بازار میں تھے تو پھر کسی میدان یا باغ میں چلے گئے۔ ان متواتر تغیرات کی وجہ سے آپ کسی چیز کو بھی اللہ کی یاد کا وسیلہ نہیں بنا سکتے۔ لیکن آپ کا سانس ایک ایسی چیز ہے جو ہر جگہ اور ہر حالت میں یکساں طور پر ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ اِسی لیے سانس کے علاوہ اور کوئی ایسا وسیلہ نہیں ہو سکتا جس کے ذریعہ سے خدا کو ہمیشہ یاد رکھا جا سکے۔

اسمِ ذات کا پاس انفاس اگر باقاعدہ اور کچھ مدت تک جم کر کیا جائے تو اس سے پہلا فائدہ جو سالک کو پہنچتا ہے وہ اطمینانِ قلب کا حصول ہے، اور یہ وہ دولت ہے جس کے لیے تمام علما و تمام فلاسفر اور تمام ماہرانِ نفسیات دِن رات مارے مارے پھرتے ہیں اور نت نئے طریقے سوچتے اور ایجاد کرتے ہیں۔ لیکن کچھ بن نہیں پڑتا۔ لیکن اسمِ ذات کے پاس انفاس سے یہ دولتِ بے قیاس تھوڑے ہی عرصہ میں حاصل ہو جاتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب کہ اپنے کلام پاک میں اللہ تبارک تعالےٰ نے اطمینانِ قلب حاصل کرنے کا یہی نسخہ تجویز فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے: الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ یعنی "بے شک اطمینانِ قلب اللہ کے

ذکر سے ملتا ہے۔"

دُوسرا فائدہ یہ ہے کہ سالک اپنی منزلِ مقصود کا راستہ سالوں کی بجائے مہینوں میں طے کرتا چلا جاتا ہے اور تھکتا نہیں۔

تیسرے یہ کہ اسی ذکر سے وہ برقی حرارت قلب میں پیدا ہوتی ہے جس کو روحانی طاقت کہا جاتا ہے۔ اور اسی حرارت سے وہ سرخوشی اور کیف و سرورِ سالک کو حاصل ہوتا ہے جو دنیوی حرام شراب پینے والوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ ان تمام فوائد کے علاوہ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اسی ذکر کے ذریعہ سے انسان کا تعلق خدا کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور جُوں جُوں اس ذکر میں پختگی پیدا ہوتی ہے یہ تعلق گہرا اور قوی سے قوی تر ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ حضور رسولِ کریمؐ کے ارشاد کے مطابق آخر کار اللہ تعالےٰ اس سالک کے کان بن جاتا ہے جن سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھیں بن جاتا ہے جن سے وہ دیکھتا ہے" اس کے ہاتھ بن جاتا ہے جن سے وہ کام کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مقام تک پہنچنے کے لیے سالک کو معمولی نماز کے علاوہ کافی وقت نوافل میں بھی گذارنا پڑتا ہے۔ لیکن اصل رُوح ان نوافل میں بھی اسی ذکر کی ہوتی ہے۔

الغرض اس طرح سالک کو خدا سے ایک قوی نسبت پیدا ہو جاتی ہے اور اب وہ اس قابل ہوتا ہے کہ ذات باری تعالےٰ کا قرب و عرفان حاصل کر سکے لیکن یہ سب کچھ دس پانچ ماہ یا دو چار سال میں نہیں ہو سکتا۔ اس مرتبہ تک پہنچنے کے لیے کافی وقت لگتا ہے۔ ہمارے حلقہ کے جو دوست دو چار سال اللہ اللہ کرنے کے بعد ہی شکایت کرنے لگتے ہیں کہ ابھی تک

کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ وہ شاید قرب و عرفانِ باری تعالےٰ کو مذاق یا دِل لگی خیال کرتے ہیں یا کوئی ایسی سستی چیز سمجھتے ہیں جو بازار سے پیسے دے کر خریدی جا سکتی ہے۔ مَیں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر تمام عمر محنت اور اللہ اللہ کرنے کے بعد مرتے وقت بھی یہ مرتبہ حاصل ہو جائے تو گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ کیونکہ رُوح کا خاصہ یہ ہے کہ جس کی محبت میں اس دُنیا سے سفر کرتی ہے اسی کے ساتھ اس کا حشر ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر آپ کو اس دُنیا میں قرب و عرفان یا لقائے باری تعالیٰ حاصل نہ ہو سکے تو مرنے کے بعد تو ضرور یہ سب چیزیں حاصل ہو جائیں گی۔ آپ کو سوچنا چاہیئے کہ انسان کا ابدی گھر تو وہی ہے۔ اگر وہاں ایک آدمی اللہ کے مقربین میں ہو تو پھر اس کو اور کیا چاہیئے۔

سورۂ واقعہ میں ارشاد ہوا ہے کہ قیامت کے دِن انسانوں کے تین گروہ ہوں گے۔ ایک بائیں والے اور ایک دائیں والے اور ایک آگے والے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ بائیں والے عذاب میں مبتلا ہوں گے یعنی دوزخی ہوں گے۔ دائیں والے عیش و آرام میں ہوں گے یعنی جنتی ہوں گے۔ آگے والوں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ ان کا کیا کہنا۔ وہ تو آگے ہی بڑھنے والے ہیں اور وہی مقرب ہیں۔ تو جو لوگ نیکی یا عبادت محض اللہ کی خوشنودی اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں کسی معاوضے اور بدلے کے خیال سے نہیں کرتے وہی مقربین میں ہوں گے اور یہ اتنی بڑی نعمت اور اتنا بلند مرتبہ ہے کہ کوئی دُوسری نعمت اور کوئی دُوسرا مرتبہ اس کا پاسنگ بھی نہیں ہو سکتا۔

تو اے برادرانِ حلقہ! میری گذارش آپ سے یہی ہے کہ آپ نیکی

کریں تو اللہ کی خوشنودی کے لیے۔ عبادت کریں تو محض اللہ کے لیے اور محبت کریں تو اللہ کے واسطے۔ آپ کے تمام اعمال و افعال اور جدوجہد کا مقصدِ وحید یہی ہونا چاہیئے کہ آپ کو اللہ کا قرب حاصل ہو۔ جیتے جی ہو جائے تو سبحان اللہ ورنہ مرنے کے بعد تو ضرور ہی یہ دولت میّسر آجائے۔ اگر آپ کی یہ خواہش مستقل اور آپ کا ارادہ پکّا ہے تو ناممکن ہے کہ آپ کو اپنی محنتوں کا ثمر نہ ملے۔ اللہ تعالےٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔

یہ تو ہُوا ذکرِ پاس انفاس کا بیان۔ دُوسرا ذکر جو ہمارے سلسلہ میں کرنا پڑتا ہے وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا ذکر ہے۔ اس ذکر کو ذکرِ نفی اثبات اس لیے کہتے ہیں کہ لا الٰہ کہتے وقت دماغ کو ہر خیال اور وسوسہ سے بالکل خالی کر لیا جاتا ہے اور الا اللہ کہتے وقت صرف اللہ کا خیال دِل میں جاگزیں رکھا جاتا ہے۔ یہ ذکر آہستہ آہستہ اور بہتر یہ ہے کہ بالجہر کیا جائے۔ یہ دراصل نفی اور اثبات کی مشق کرانے کے لیے کرایا جاتا ہے۔ اس لیے جب تک ذاکر لا الٰہ پر دو چار سیکنڈ ٹھہرے گا نہیں نفی کی مشق نہ ہو سکے گی۔ اسی طرح الا اللہ کے بعد جب تک چند سیکنڈ کا وقفہ نہ ہو اثبات کی عادت نہ پڑے گی۔ یہ ذکر بالکل تنہائی میں نہایت جمعیت خاطر کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ بہت سے آدمیوں کے ساتھ حلقہ ذکر میں بالجہر ذکر کرنا بھی فائدے سے خالی نہیں لیکن اصل فائدہ تنہائی میں آہستہ آہستہ ذکر کرنے سے ہی ہوتا ہے۔ پچھلے خطبوں میں سے کسی ایک میں بتا چکا ہوں کہ جب تک نفی کی مشق کافی نہ ہو عالمِ روحانی سے دماغ کا تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفی کی کیفیت نہ ہو تو انسان کے پانچوں حواس ظاہری اس کا تعلق دُنیا اور ماحول سے قائم رکھتے ہیں۔ لیکن نفی کی حالت میں یہ حواس

معطل ہو جاتے ہیں اور جب یہ حواس معطل ہو جائیں تو لاشعور بیدار ہو جاتا ہے
اور لاشعور اس مادّی دُنیا اور روحانی دُنیا کے بیچ میں ایک برزخ ہے۔ جب
حواس ظاہری معطل اور لاشعور بیدار ہو جاتا ہے تو سالک کا تعلق مادّی عالم
سے منقطع ہو کر روحانی عالم سے جڑ جاتا ہے۔ نفی کی زیادہ مشق کرنے کے لیے ذکر
نفی اثبات کے علاوہ اور اوقات میں بھی کوشش کرنی چاہیئے۔ مثلاً دن میں
کسی وقت جب مکمل تنہائی ہو یا رات کو سوتے وقت دماغ سے تمام خیالات
نکال کر نفی کی حالت میں کچھ دیر بیٹھے رہنا یا سو جانا بہت مفید ہے۔ مگر نفی کی
بہت زیادہ مشق بہت احتیاط سے کرنا چاہیئے۔ اور نفی کے وقفوں کو درجہ بدرجہ
آہستہ آہستہ بڑھانا چاہیئے ورنہ نسیان پیدا ہونے اور بے ہوشی کے دورے
پڑنے کا سخت خطرہ ہے جو کسی حالت میں بھی اچھا نہیں ہے۔ کامل نفی کی کیفیت
یہ ہوتی ہے کہ انسان بھرے مجمع میں بیٹھا ہوتا ہے لیکن نہ اسے اپنے تن بدن
کا احساس ہوتا ہے اور نہ کسی اور کی موجودگی کا۔ نہ اسے کوئی شکل دکھائی دیتی
ہے نہ کوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ لیکن صرف نفی کی کیفیت پیدا کر لینا کافی نہیں
نفی کی حالت میں کسی خاص شخص یا چیز کا خیال دماغ میں پیدا کرنے اور اس
خیال کو مستقلاً کچھ دیر تک قائم رکھنے کی طاقت و لیاقت کا پیدا کرنا بھی بہت
ضروری ہے۔ یہی صحیح قسم کا ارتکازِ خیال ہے اور اسی کو اثبات کہتے ہیں۔
نفی کی مثال اس سفید کاغذ کی سی ہے جو بالکل صاف ہو اور اس پر ایک حرف
بھی لکھا ہُوا نہ ہو۔

اثبات کی مثال یہ ہے کہ اس سفید کاغذ پر صرف ایک نقطہ لگا دیا جائے
یا ایک لفظ لکھ دیا جائے۔ اب جو کوئی اس نقطہ یا لفظ کو دیکھے گا اس کی
ساری توجّہ اسی کی طرف مرکوز رہے گی اور کسی طرف نہ ہٹ سکے گی۔ اسی طرح

جب سالک کو اچھی طرح نفی کرنے کی عادت ہو جائے تو وہ اپنی قوتِ ارادی سے اس نفی کے عالم میں اللہ کا تصوّر دماغ میں قائم کرے۔ اس طرح تصوّر کرنے سے سالک کو خدا کے ساتھ جو رابطہ پیدا ہوگا وہ دُوسری کسی ترکیب سے نہیں ہو سکتا۔ ایسے تصوّر کے لیے اکثر احباب حلقہ مجھ سے یہ دریافت کرتے رہتے ہیں کہ اللہ کے تو کوئی ایسا جسم نہیں جس کی مثال دینا اور ہمارے علم میں موجود ہو۔ پھر ہم اس کا تصوّر کس طرح کر سکتے ہیں۔ میں ان سوالات کا بہت دفعہ جواب دے چکا ہوں اور اب یہاں بھی بیان کرتا ہوں۔

پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ کسی تصوّر کی ضرورت ہی نہیں۔ صرف اللہ یاد ہو بغیر تصوّر کے جو لوگ باقاعدہ پاس انفاس کرتے رہے ہوں اور اللہ تعالےٰ کی یاد ان کے دِل میں قائم ہو چکی ہو ان کے لیے بغیر تصوّر کے اللہ کو یاد رکھنا کچھ دشوار نہیں ہے۔ یہ چیز ان کو پہلے ہی سے حاصل ہے۔

دُوسرا طریقہ یہ ہے کہ خلائے محض کا تصور کیا جائے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ لفظ اللہ کا تصور کیا جائے۔ ان میں سے جس طرح بھی اللہ کا اثبات ہو سکے، کامیابی کے لیے کافی ہے۔

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ سورۂ مزمل کی متذکرۃ الصدر آیت کے پہلے ٹکڑے واذکر اسم ربك کی تشریح ہے۔ اب وتبتل الیہ تبتیلا کی تفسیر بیان کی جاتی ہے اس کے معنی ہیں کہ سب کو چھوڑ کر اللہ کے ہو جاؤ۔ یہ سلوک کی انتہا ہے۔ بہت سے لوگ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ دُنیا کو چھوڑ کر کہیں تنہائی میں جا بیٹھو اور ساری عمر اللہ اللہ میں بسر کر دو۔ اس طرح ترک دُنیا کو رہبانیت کہتے ہیں اور رہبانیت اسلام میں منع ہے۔ اگر اس آیت کا مطلب یہی ہوتا تو حضور اکرمؐ بھی ایسا ہی کرتے اور دُنیا چھوڑ کر کہیں جنگل یا

پہاڑوں میں جا بیٹھتے۔ لیکن حضورؐ کی سیرت پاک گواہ ہے کہ حضورؐ نے دُنیا کو کبھی ترک نہیں کیا۔ بلکہ آخری دم تک دُنیا کے سارے کام بخوبی انجام دیتے رہے۔ اس لیے اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دُنیا کو چھوڑ کر رہبانیت کی زندگی اختیار کرو۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ قلبی و روحانی تعلق تمہارا صرف اللہ سے قائم رہے اور ساتھ ہی دُنیا کے سارے کام بھی کرتے رہو۔ حلقہ کے بہت سے احباب مجھ سے پوچھا کرتے ہیں کہ ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ اہلِ دُنیا کے جتنے حقوق ہیں سب پوری طرح ادا کرو۔ بیوی بچوّں، ماں باپ، بہن بھائی، عزیز و اقارب اور ہمسایوں بلکہ تمام مخلوقِ خدا سے عالمگیر محبت کرو۔ دُوسری طرف کہتے ہیں کہ محبت اور دلی تعلق صرف اللہ سے رکھو۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہمارا دلی تعلق ہی کسی سے نہ ہو تو ہم اس سے محبت کس طرح کر سکتے ہیں اور جب محبّت ہی نہ ہو تو اس کے حقوق کس طرح ادا کر سکتے ہیں۔

اہلِ حلقہ کا یہ اعتراض واقعی بہت وقیع ہے۔ اور بظاہر اس کا کوئی جواب نہیں۔ لیکن اس کا صحیح جواب زبانی طور پر دیا جائے تو پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ عمل کر کے دیکھا جائے تو سمجھ میں آ جاتا ہے۔ مجھے اپنے ذاتی اور دُوسرے احباب کے تجربہ سے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ بات بالکل ممکن ہے۔ دراصل محبت کے مدارج ہوتے ہیں۔ ایک آدمی اگر سو آدمیوں سے محبت کرتا ہے تو سب کی محبت برابر نہیں ہو سکتی۔ ہر دو آدمیوں کی محبت میں کچھ نہ کچھ کمی بیشی ضرور ہوتی ہے۔ ایک ماں کے دس بچے ہیں اور وہ سبھی سے محبت کرتی ہے۔ لیکن تمام بچوّں سے اس کی محبت برابر نہیں ہوتی بلکہ ہر بچےّ کے ساتھ اس کی محبت میں دُوسروں کی بہ نسبت کسی نہ کسی قدر کمی یا زیادتی ضرور ہوتی ہے۔ کسی بچےّ کے ساتھ اس کی محبت معمولی ہوتی ہے لیکن کسی سے یہ محبت عشق کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا

ہے کہ ماں باپ سب سے چھوٹے بچّے سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں دوسروں سے اتنی محبت نہیں کرتے۔ اللہ تعالےٰ کی مخلوق کا کچھ شمار نہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے ہر فرد سے برابر کی محبت نہیں کرتا۔ انبیا اللہ تعالےٰ کو سب سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں اس کے بعد صحابۂ عظام اور پھر اولیائے کرام وقس علیٰ ہذا۔ بعینہٖ یہی حال خالق و مخلوق کے ساتھ سالک کی محبت کا ہوتا ہے۔ وہ واقعی مخلوق کے ہر فرد سے محبت کرتا ہے۔ لیکن ہر ایک ساتھ اس کی محبت کچھ کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ اور یہ کمی بیشی خاص ماحول اور خاص حالات میں ایسوسی ایشن یعنی ربط و ضبط اور معیت و یگانگت کے لحاظ سے ہُوا کرتی ہے۔ جو جتنا زیادہ ساتھ رہتا ہے، جتنی زیادہ خدمت کرتا ہے یا ہم خیال ہوتا ہے اس سے اتنی ہی زیادہ محبت ہو جاتی ہے۔ جس کے ساتھ یہ حالات و مواقع جس قدر کم پیش آتے ہیں اس سے اتنی ہی محبت کم ہوتی ہے۔ محبت ہمیشہ اظہار ہمدردی اور خدمت سے ظاہر ہوتی ہے۔ جن لوگوں سے عمر بھر کبھی ملنا ہی نہ ہو ان کے ساتھ محبت کے اظہار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہوتا یہ ہے کہ دِل میں مخلوقِ خدا خصوصاً نوعِ انسان کی محبت کا جذبہ ہمیشہ موجزن رہتا ہے جس کا اظہار ملتے جلتے یا کسی کے حالات سنتے وقت برابر ہوتا رہتا ہے۔ ایک طرف تو یہ ہوتا ہے دُوسری طرف اللہ کی محبت کی آگ ہر وقت سلگتی رہتی ہے اور جب اس کو اللہ کا خیال آتا ہے یا اللہ کا نام اس کے کان میں پڑتا ہے تو وہ مخلوق کو بھُول جاتا ہے اور صرف اللہ کی محبت محسوس ہوتے لگتی ہے اور جب اس کو کوئی رنج یا تکلیف ہوتی ہے تو اس کا خیال رنج یا تکلیف پہنچانے والے کی طرف نہیں جاتا بلکہ یہی خیال آتا ہے کہ تکلیف اللہ کی طرف سے ہے۔ جب چوٹ لگتی ہے تو وہ بے اختیار پکار اُٹھتا ہے کہ یا اللہ یہ سزا آپ نے مجھے کس جرم کی دی

ہے۔ جب اس کو کوئی خوشی ہوتی ہے تو سجدۂ شکر بجالاتا ہے اور کہتا ہے کہ یا اللہ میں اس قابل نہ تھا۔ یہ محض آپ کا فضل ہے۔ جب بازاروں اور محفلوں کی چہل پہل کو دیکھتا ہے تو بھی اس کو اللہ ہی یاد آتا ہے۔ باغ میں جاتا ہے ہوا اس کے جسم کو لگتی ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا ہی اس کو گدگدا رہا ہے۔ جب وہ سبزہ کو لہلہاتا، پرندوں کو چہچہاتا اور پھولوں کو مسکراتا دیکھتا ہے تو ان سب میں بھی اس کو خدا ہی کا حسنِ جہاں افروز نظر آتا ہے۔ جب مذبح میں جانوروں اور میدانِ جنگ میں زخمیوں کو تڑپتا اور سسکتا دیکھتا ہے تو وہاں بھی اس کو خدا کا ہاتھ ہی کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ غرض مخلوق کا ہر فرد اس کو خدا کی یاد دلاتا اور خدا سے اس کی آتشِ الفت کو بھڑکاتا رہتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ جب وہ مخلوقِ خدا کی طرف کسی کام کے لیے متوجہ ہوتا ہے تو پوری محبت سے ان کے ساتھ پیش آتا ہے اور جب اور کوئی اس کے سامنے نہیں ہوتا تو اس کا دل و دماغ صرف خدا کے ساتھ مشغول رہتا ہے بقول مومنؔ کیفیت یہ ہوتی ہے:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یوں سمجھئے کہ وہ مخلوق سے جو محبت کرتا ہے اس کو اپنے خالق کی نشانی سمجھ کر کرتا ہے اس کے علاوہ وہ سوائے خدا کے نہ کسی سے ڈرتا ہے نہ کسی قسم کی توقع رکھتا ہے۔ رنج یا خوشی جو کچھ بھی پیش آئے وہ اس کو خدا کا عطیہ اور انعام سمجھتا ہے اور ہر حال میں راضی برضائے الٰہی رہ کر خوش اور مگن رہتا ہے۔

الغرض یہی ہے وہ کیفیت جس کو اصطلاحِ تصوّف میں قطع ماسوی اللہ کہتے ہیں اور یہی تفسیر ہے وتبتل الیہ تبتیلا کی۔ اس مقام تک پہنچنے کے بعد امتحانات اور آزمائشیں ختم ہو جاتی ہیں اور انعامات و اکرامات کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہاں

پہنچ کر سالک کو کیا ملتا ہے۔ اس کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں، کیونکہ خدا کی نعمتیں بے شمار اور اس کا فضل ایک دریائے ناپیدا کنار ہے۔

یہاں تک جو کچھ بیان ہُوا وہ سلوک کی ابتدا اور انتہا کی بابت تھا۔ لیکن ان دونوں کے درمیان بھی بہت کچھ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے دُوسری آیتوں میں جا بجا فرمایا ہے۔ ان سب آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صاحبِ مرتبۂ احسان بننا چاہے تو اس کو عبادات و ذکر کے ساتھ ایک مثالی کردار بھی پیدا کرنا چاہیئے جو تزکیۂ اخلاق سے پیدا ہوتا ہے۔ اور حق بھی یہی ہے کہ جب تک کسی کا اخلاق قرآن و سنّت رسول اکرمؐ کے معیار کے مطابق نہ ہو وہ ولی اللہ تو کیا بنے گا اچھا مُسلمان بھی نہ بن سکے گا۔ اس لیے جو کوئی اللہ کا قرب و عرفان حاصل کرنا چاہے اس کے لیے اخلاق کا تزکیہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ عبادت اور ذکر۔ تزکیۂ اخلاق بغیر سخت کوشش اور مجاہدے کے بالکل ناممکن ہے۔ کیونکہ پُرانی بگڑی ہوئی عادات کو دُور کر کے نئی پاک اور صالح عادات پیدا کرنا اگرچہ ناممکن نہیں، تاہم بہت ہی دشوار بات ہے۔

اخلاق کیا ہے؟ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ آپ پر آپ کے ماں باپ، اہل و عیال، عزیز و اقارب، ہمسایوں، اہلِ محلہ، اہلِ شہر، اہلِ وطن اور اہلِ جہاں کے بے شمار حقوق ہیں۔ ان حقوق کو اپنا فرض جان کر ادا کرنا اخلاق کہلاتا ہے۔ اب اگر آپ یہ حقوق خوشی و خوش اسلوبی سے ادا کریں تو یہ خوش اخلاقی ہے۔ لیکن اگر آپ یہ حقوق بددلی سے بہ مجبوری و بہ کراہت ادا کریں تو یہ بد اخلاقی ہے اور اگر آپ یہ حقوق ادا ہی نہ کریں تب تو آپ انسانیت کے دائرے ہی سے خارج ہیں ہرگز انسان کہلانے کے مستحق نہیں۔ کوئی انسان اس دُنیا میں دُوسروں کی مدد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ آپ بھی اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے دُوسروں کے

دستِ نگر ہیں۔ پھر یہ کیا کہ آپ تو دُوسروں کی مدد سے اپنی زندگی کو خوشگوار بنا لیں لیکن خود دوسروں کی مدد نہ کریں۔ دُنیا میں صرف وہی قوم اور وہی مُعاشرہ خوش حال اور طاقت ور بن سکتا ہے جس کے افراد ایک دُوسرے سے محبت کرتے ہوں اور ہر شخص دُوسروں کی ہر ممکن مدد کر کے ان کو خوش حال اور طاقتور بنانے میں مدد دے مُسلمانوں کی کمزوری اور پس ماندگی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے افراد گرے ہوؤں کو اُٹھانے اور بگڑے ہوؤں کو بنانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اُلٹا گرے ہوؤں کو دو لاتیں اور لگانے اور بگڑے ہوؤں کو بالکل ہی مٹا دینے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں شاید یہ بات آپ کی نظر نہ چڑھ سکے لیکن دیہات میں جہاں آبادی تھوڑی ہوتی ہے یہ نظارے آپ اپنی آنکھ سے روز مرّہ ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے حلقۂ والوں کا فرض ہے کہ اپنے اپنے خاندان اور برادری میں جہاں تک ان کا دائرۂ اثر ہو اس خرابی کو دُور کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ کوشش نہایت نرمی، خوبصورتی اور محبت سے کی جائے۔ ورنہ لوگ انہی کے خلاف ہو جائیں گے اور فساد بجائے کم ہونے کے اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ اگر آپ کی کوششوں سے کسی ایک خاندان کی بھی اصلاح ہو جائے تو یوں سمجھئے کہ انشاءاللہ آپ کی نجات کا پروانہ مل گیا۔ کیونکہ یہ خیر جاریہ ہوگی اور اس خاندان کی تقلید میں دُوسرے لوگ بھی اصلاح کی طرف قدم اُٹھائیں گے ورنہ خود اس خاندان کے افراد تو نسلاً بعد نسلاً خوب سے خوب تر ہوتے چلے جائیں گے۔

سلوک میں تزکیۂ اخلاق کے جو طریقے رائج ہیں اُن کو اصطلاحِ تصوّف میں نفس کشی کہتے ہیں نفس کشی کے لفظی معنی ہیں نفس کو ہلاک کرنا۔ ہلاک کرتے

کا طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ نفس جو کچھ کہے اُس کے خلاف کرو۔ اگر وہ کھانے کو کہے تو بھوکا رکھو۔ ٹھنڈا پانی طلب کرے تو پیاسا رکھو یا گرم پانی پلاؤ۔ سونے کو کہے تو جاگتا رکھو۔ وغیرہ وغیرہ۔

دُوسرے مذاہب کے تصوّف میں نفس کشی کے طریقے ناقابلِ یقین طور پر سخت و درشت ہیں۔ یہ لوگ اپنے جسم کو اس قدر تکلیفیں دیتے ہیں کہ اکثر اوقات جسم نکمّا اور دماغ بیکار ہو جاتا ہے۔ اکثر ہندو جوگی اور سادھو گرمی ہو یا سردی ہمیشہ ننگے رہتے ہیں۔ جسم کی حفاظت بالکل نہیں کرتے۔ مئی اور جُون کی کڑاکے دار دُھوپ میں گرم اور تپتی ہوئی ریت پر پڑے جلتے بھنتے رہتے ہیں۔ سردی میں خواہ برف پڑ رہی ہو ایک لنگوٹی باندھے جنگل میں یا کسی سڑک کے کنارے سارا موسم سرما گذار دیتے ہیں۔ کئی کئی دِن تک بھوکے اور پیاسے رہتے ہیں۔ کوئی شخص اپنا ایک ہاتھ پھیلائے برسوں کھڑا رہتا ہے یہاں تک کہ ہاتھ سوکھ جاتا ہے۔ کوئی ایک ٹانگ پر کھڑے کھڑے اپنی ٹانگ سکھا لیتا ہے۔ عیسائی راہبوں میں جسم آزاری اس سے بھی کہیں زیادہ سختی سے کی جاتی ہے۔ ایسے موٹے اُون کے کپڑے پہننا جو بدن میں کانٹوں کی طرح چبھیں اور کئی کئی دِن تک بھُوکے پیاسے رہنا تو اُن کی عام عادت ہے۔ لیکن بعض بعض لوگ تو حد سے گذر جاتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنے جسم کو کوڑوں اور زنجیروں سے پیٹ پیٹ کر لہولہان کر لیتے ہیں۔ اپنے بستروں پر کانٹے یا لوہے کی کیلیں اس طرح بچھاتے ہیں کہ نوکیں اُوپر کو رہتی ہیں اور جب تک وہ لیٹے رہتے ہیں برابر چبھتی رہتی ہیں۔

دُوسرے مذاہب میں بھی یہی کچھ ہے۔ لیکن اسلام اس قسم کی جسم آزاری کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن میں متعدّد جگہ اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتا ہے کہ اپنے نفس کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ اسلامی سلوک میں تو کھانے پینے پر بھی کوئی پابندی نہیں۔

آپ بہتر سے بہتر اور نفیس سے نفیس غذائیں کھا سکتے ہیں۔ ہاں بسیار خوری اور پرخوری البتہ منع ہے۔ اتنا ہر گز نہ کھانا چاہیئے کہ طبیعت بھاری ہو جائے دن سستی اور کاہلی میں گذرے اور رات کو جب اللہ اللہ کرنے کا وقت آئے جاگنا محال ہو جائے۔ کپڑوں پر بھی کوئی قید نہیں سوائے ریشمی لباس کے۔ لیکن بہتر اور افضل یہی ہے کہ سلوک کے دوران سالک سادہ کھائے سادہ پہنے اور ہر لحاظ سے سادہ زندگی گذارنے کی عادت ڈالے اور سپاہیانہ خصلت پیدا کرے ورنہ ایک تو سہل انگاری پیدا ہو گی دوسرے طبیعت میں ممکن ہے غرور و تکبر پیدا ہو جائے جو راہ سلوک کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اسلامی سلوک میں نفس کشی یہ ہے کہ اللہ تعالے نے امر و نہی کی جو حدود مقرر کر دی ہیں ان کو قطع نہ کیا جائے۔ بجائے خود یہ کام بھی کچھ آسان نہیں۔ اس کے لیے بھی سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ عام انسانوں میں نفس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ برائیوں کی طرف فوراً لپکتا ہے اور نیکیوں کی طرف بڑھنے میں سو حیل و حجت کرتا ہے۔ اس لیے سالک راہِ طریقت کو چاہیئے کہ ایسے برے ماحول اور بری صحبت سے دور بھاگے جہاں یہ اندیشہ ہو کہ نفس کسی برائی کی طرف راغب ہو گا، نیک اور خصوصاً اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھا کرے جہاں اللہ اور اس کے رسولؐ کا ذکر ہوتا ہو اور اچھی باتیں بتائی جاتی ہوں۔ بری صحبت آگ کی طرح ہے کہ اس میں ہاتھ ڈالو گے تو ضرور جلے گا۔ جو آدمی بری صحبت میں رہے گا اس میں برائی پیدا ہو گی۔ جو اچھی صحبت میں رہے گا اس میں خوبیاں پیدا ہوں گی۔ اس کے باوجود اگر نفس میں کوئی بری خواہش پیدا ہو تو فوراً دماغ کو پاس انفاس کے ذریعہ اللہ کی طرف رجوع کر لیجیے۔ اس طرح بھی کام نہ بنے تو وضو کیجئے اور دو یا چار نفل نماز ادا کیجیے اور استغفار کی دو ایک تسبیحیں پڑھیے۔

مقصد یہ ہے کہ کسی بُرے کام کا ارتکاب نہ ہونے پائے۔ یہ بات کہ دماغ میں بُرے خیال بھی نہ آئیں یہ مبتدیوں کے بس کی بات نہیں۔ یہ تو منتہیوں کا کام ہے اور یہ صفائی تو مرتے دم تک ہوتی رہتی ہے۔

اعلیٰ ترین اخلاق پیدا کرنے کے لیے چند باتوں کی عادت ڈالنا ضروری ہے جن میں سب سے اہم چیز صبر یا قوت برداشت ہے۔ اس طاقت کے بل پر دُنیاوی زندگی تو سکون و راحت سے بسر ہوتی ہی ہے، روحانی منازل و مقامات طے کرنے کے لیے یہ اور بھی زیادہ مفید و ممد ہے۔ بات یہ ہے کہ اللہ کا راستہ طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دِن کے چوبیس گھنٹوں میں زیادہ وقت تک اللہ کا خیال دِل و دماغ میں رچا بسا رہے اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب کہ دِل و دماغ تفکّرات و تکلیفات سے متاثر نہ ہو لیکن ایسا ہونا اگرچہ ناممکن نہیں بیحد مشکل ضرور ہے۔

اللہ تعالےٰ خود فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو تکلیفوں کے بیچ میں پیدا کیا ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ دُنیا میں رہتے ہوئے اور ہر وقت، نت نئے غم و فکر کا مقابلہ کرتے ہوئے دِل ان سے کوئی اثر ہی نہ لے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مشکل ترین کام بھی "ذکر" کی بدولت بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ذکر سے سالک کے دِل میں ایک ایسا سُرور و نشہ پیدا ہوتا ہے جس کے مزے میں دِل و دماغ بڑے سے بڑے فکر اور صدمے کا اثر قبول نہیں کرتا۔ دُوسرے اللہ تعالیٰ سے ایک ایسا تعلق قائم ہو جاتا ہے اور ایسی لگن لگتی ہے کہ بڑے سے بڑے صدمے اور فکر کا اثر دس پانچ سیکنڈ یا زیادہ سے زیادہ دس پانچ منٹ سے زیادہ دِل و دماغ پر مسلط نہیں رہنے پاتا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ چونکہ سالک ہر معاملے کو اللہ ہی کی طرف سے سمجھتا ہے

اور ہر بات میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرتا ہے اس لیے وہ رنج وغم سے اسقدر متاثر نہیں ہوتا جس قدر عوام ہوتے ہیں۔ وہ چونکہ خدا سے محبت کرتا ہے اس لیے خدا کی بھیجی ہوئی کوئی چیز بھی اس کو بُری نہیں لگتی۔ علاوہ ازیں وہ قرآن پڑھتا ہے اور اس میں جو وعدے کیے گئے ہیں اُن کی سچائی پر ایمان رکھتا ہے اس لیے وہ جانتا ہے کہ خدا جو کچھ بھی کرتا ہے اور جو کچھ بھی بھیجتا ہے وہ اچھا ہی ہوتا ہے بُرا ہو ہی نہیں سکتا۔

" اللہ تعالٰے فرماتا ہے کہ " اللہ تم پر تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک بنائے اور تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرے "۔ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی پر مصائب یا تکالیف ڈالتا ہے تو تکلیف و آزار پہنچانے کے لیے نہیں ڈالتا بلکہ وہ اُس کو اس قابل بنانا چاہتا ہے کہ اس پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرے۔ ایک سالک راہ طریقت کو چونکہ قرآن کی ہر آیت پر یقین کامل ہوتا ہے اس لیے تکلیف و مصیبت کے وقت وہ اس آیت کی روشنی میں تکلیف کی بجائے الٹا سکون حاصل کرتا ہے اور یہ یقین کر کے خوش ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تکلیف و مصیبت کے بعد ضرور کوئی اچھی سی نعمت عطا فرمائے گا۔ یہ بات تو سبھی مانتے ہیں کہ مصیبت میں خدا خوب یاد آتا ہے۔ اس لیے مصیبت اس لحاظ سے بھی اچھی ہے کہ وہ خدا کی یاد کو بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔ مصائب میں سب سے بڑی مصیبت رزق کی کمی یا فاقہ کی ہے۔ سالک پر جب رزق کی تنگی ہوتی ہے۔ یا سچ مچ ہی فاقے ہونے لگتے ہیں تب بھی وہ ہراساں نہیں ہوتا اور اللہ تعالٰے کے اس وعدے کو یاد کر کے بے فکر ہو جاتا ہے کہ میرا رزق آسمان میں ہے اور وہ مجھ کو ضرور پہنچایا جائے گا۔ اسی طرح وہ بیماری سے بھی نہیں گھبراتا۔ وہ جانتا ہے کہ بیماری سے گناہ ہلکے ہوتے ہیں

اور خدا زیادہ یاد آتا ہے۔ اسے اطمینان ہوتا ہے کہ ہر ایک مصیبت کا وقت مقرر ہے جب وقت آئے گا وہ تندرست ہو جائے گا۔ بیماری تو کیا وہ موت سے بھی نہیں ڈرتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے اُس وقت سے نہ ایک ساعت پہلے آسکتی ہے نہ بعد میں۔ الغرض وہ کسی مصیبت اور تکلیف سے اپنے دماغ کو متاثر نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ مصائب و تکالیف میں اور بھی زیادہ اللہ کی طرف رجوع ہو جاتا ہے جس سے اس کو انتہائی سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے اور اللہ سے اس کے تعلق اور قرب میں زیادتی ہوتی چلی جاتی ہے۔

برادرانِ حلقہ! یاد رکھئے کہ ہر وہ شے جو خدا کی یاد سے غافل کر دے راہِ سلوک کی رکاوٹ ہے اور ترقی اسی وقت ہوتی ہے اور روحانی طاقت اسی وقت بڑھتی ہے جبکہ راستے کی رکاوٹوں کو قوتِ ارادی کی طاقت سے ٹھکرا کر دُور کر دیا جائے۔ راستہ کی رکاوٹیں صرف مصائب و آلام ہی نہیں عیش و آرام اور دولت و ثروت زیادہ خطرناک رکاوٹیں ہیں۔ یہ سالک کو اللہ کی طرف سے بہت جلدی غافل کر دیتی ہیں۔ اس لیے جس کے پاس دولت و ثروت نہ ہو اس کو رنجیدہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ شکر کرنا چاہیئے کہ اللہ نے اس کو ایسی مہلک آزمائش اور رکاوٹ سے محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو اللہ نے دولت دی ہے ان کو ڈرنا اور ہر وقت ہوشیار رہنا چاہیئے کہ کہیں یہ سنہری روپہلی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں اس کو خدا کے ساتھ ملنے سے باز نہ رکھیں۔ جس طرح سالک مصائب کے اثرات سے دِل کو محفوظ رکھتا ہے اسی طرح دولت کا اثر بھی دِل و دماغ پر ہرگز نہ ہونے دینا چاہیئے۔ دولت بُری شے نہیں اگر اس کو اللہ کے راستے میں خرچ کیا جائے۔ اس میں سے اگر اللہ کو قرض حسنہ دیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو سینکڑوں گُنا زیادہ کر کے واپس کرتا ہے۔

البتہ اگر اس کو لہو و لعب اور بدکاری پر اُٹھایا جائے تو پھر یہ فتنۂ عظیم ہے خدا کا قرب و عرفان تو بہت بڑی بات ہے۔ ڈر ہے کہ ایسے لوگوں کو جنّت بھی شاید ہی ملے۔ اس لیے دولت کو بُرے کاموں میں ہرگز خرچ نہ کرو۔ نہ اس پر غرور و تکبر کرنے لگو۔ ہر وقت خدا سے ڈرتے اور یہی دُعا کرتے رہو کہ وہ تم کو دولت کے شر سے محفوظ و مامون رکھے اور نیک کاموں میں خرچ کرنے بالخصوص غریبوں کی مدد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

قوتِ برداشت پیدا کرنے کی ایک آسان ترکیب یہ بھی ہے کہ غصّہ اور نفرت کو بالکل نفی کر دیا جائے۔ غصّہ ہمیشہ ایسی بات پر آتا ہے جو ناگوار ہو اور نفرت اسی چیز سے ہوتی ہے جو بری لگے۔ اس طرح کسی بات کے ناگوار ہونے یا بری لگنے کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔ دِن میں متعدد بار ایسے واقعات ہوتے ہیں جو انسان کو ناگوار گذرتے ہیں اس لیے دِن کا بیشتر حصّہ جلنے کڑھنے اور غصّہ کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ سکون نصیب نہیں ہوتا۔ جن لوگوں کو ہر وہ بات بُری لگتی ہے جو اُن کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتی اُن کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے اور وہ کوئی مفید کام کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ اس لیے سکون اور اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی اس عادت کی اصلاح کرے اور کم از کم چھوٹی چھوٹی باتوں پر بُرا ماننا، مُنہ پھلانا، ناک بھوں چڑھانا اور چیں بہ جبیں ہونا چھوڑ دے۔ اس اس پر بھی اگر کبھی غصّہ آ ہی جائے تو غصّہ اُتر جانے کے بعد یہ سوچنا اور غور کرنا چاہیئے کہ آپ کو غصّہ کرنے سے کیا فائدہ ہُوا۔ بار بار غور کرنے اور سوچنے سے آپ کو محسوس ہونے لگے گا کہ غصّہ کرنے سے فائدہ تو کچھ نہیں ہوتا دِل و دماغ البتہ پریشان ہو جاتے ہیں اور طبیعت کافی عرصہ تک بدمزہ رہتی ہے۔

یہی بات نفرت پر بھی صادق آتی ہے۔ جن چیزوں یا آدمیوں سے آپ کو نفرت ہوتی ہے ان کا کچھ بگڑتا نہیں، خود آپ ہی کے دل و دماغ کو تکلیف ہوتی ہے۔ اگر اس نقطۂ نظر سے کافی عرصہ تک آپ غور کرنے کی عادت ڈال لیں تو بعد میں آپ کو خود اپنے اوپر ہنسی آنے لگے گی کہ کن فضول باتوں پر پریشان ہو کر خود اپنے آپ کو بے وجہ تکلیف پہنچاتے رہے ہیں۔

جب چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصّہ آنا بند ہو جائے اور معمولی معمولی چیزوں سے نفرت جاتی رہے تو سمجھنا چاہیئے کہ قوت برداشت ترقی کر رہی ہے۔ اس کے بعد بڑی بڑی باتوں پر غصّہ اور نفرت کی نفی کرنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ نفرت کا جذبہ جاتا رہے اور صرف ناپسندیدگی باقی رہ جائے۔ یاد رکھئے کہ غصّہ جو ایک فطرتی جذبہ ہے بالکل تو نفی نہیں ہو گا تاہم کنٹرول اور قابو میں آجائے گا۔ اکثر اہلِ حلقہ مجھ سے کہا کرتے ہیں کہ کبھی کبھی آپ کو بھی تو غصّہ آجاتا ہے۔ ان کا یہ کہنا بالکل درست ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ غصّہ صرف میری آواز اور چہرے ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ میرے دل و دماغ پر غصّہ کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بالکل اس طرح جیسے کہ طوفان کے وقت سمندر کی صرف سطح متلاطم ہوتی ہے نیچے تہ پر کامل سکون ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کو یہ عادت پڑ جائے تو اسے حق ہے کہ ضرورت پڑنے پر غصّہ کا اظہار کر لیا کرے۔ ہمارے حلقے کے بہت سے آدمی افسر ہیں اور ان کو اپنے ماتحتوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر ماتحت نرمی سے نہ مانیں تو اُس وقت اوپری دل سے ڈانٹ ڈپٹ اور غصّہ کا اظہار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مَیں نے **تعمیر ملت** میں صاف صاف تو لکھ دیا ہے کہ غصّہ ایک فطرتی جذبہ ہے جو بالکل کبھی نہیں مرتا قابو میں ضرور آجاتا ہے لیکن یہ بات اُس کو بالکل نفی کرنے کی کوشش ہی سے حاصل ہو سکتی

ہے۔ اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسی بات جس پر غصہ قدرتاً آنا چاہیئے اس پر غصہ ضرور آتا ہے لیکن وہ آپ کے دِل و دماغ اور عقل کو اس قدر متاثر نہیں کر سکتا کہ آپ کوئی ناجائز یا نقصان دہ حرکت کر بیٹھیں۔

اس تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک آپ کی ذات کا تعلق ہے کوئی شخص آپ کے ساتھ کتنی ہی بُرائی کرے آپ کو غصہ نہیں آنا چاہیئے بلکہ جواباً اُس کے ساتھ نرمی اور خوش اخلاقی کا سلوک کرنا چاہیئے۔ ہاں جب معاملہ آپ کی ذات سے گذر جائے اور آپ کی خاندانی، قومی یا مذہبی عزّت پر زد پڑتی ہو اس وقت غصہ آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اس وقت بھی غصہ اس حد تک قابو میں رہنا چاہیئے کہ کوئی غیر قانونی یا غیر شرعی حرکت ہرگز سرزد نہ ہونے پائے۔ آپ اپنے ناموس اور قومی و مذہبی عصمت و عزت کا دفاع کرنے کے لیے ہر ایسا قدم اُٹھا سکتے ہیں جو شرعاً اور قانوناً جائز ہو۔ آپ روزانہ اخبارات میں ایسی خبریں پڑھتے رہتے ہیں کہ فلاں نے فلاں کو دو چار آنے یا دو چار روپیہ کے لیے جان سے مار ڈالا۔ اپنی مستورات کے متعلق ذرا سے شبہ پر کئی آدمیوں کو قتل کر ڈالا یا پورے خاندان کا صفایا کر دیا۔ گھر کو آگ لگادی یا خودکشی کرلی۔ یہ سب حرکات مُعاشرہ کے لیے بیحد تباہ کن ہیں اور محض اس وجہ سے ظہور پذیر ہوتی ہیں کہ آدمیوں کو ذرا ذرا سی بات پر غصہ آجاتا ہے اور ان کی عقل ماری جاتی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ اخبارات ایسی خبروں کو بڑی بڑی جلی سُرخیوں سے خوب نمایاں طور پر شائع کرتے ہیں۔ شاید ان اخبارات کے ناشر یہ سمجھتے ہوں کہ اس طرح لوگوں کو عبرت ہوگی اور یہ جرائم کم ہو جائیں گے۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے نصیحت اور عبرت تو دو چار پڑھے لکھے لوگوں ہی کو ہوتی ہو گی البتہ جہلا کو ایسے جرائم کے

ارتکاب پر جسارت ضرور ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو قرآن مجید میں فرمایا ہے۔
لا یحب اللہ الجھر بالسوء یعنی کسی بُری بات کو بلند آواز سے بھی بیان
نہ کرو۔" یہ نعوذ باللہ بیکار تو نہیں فرمایا۔ سمجھنا چاہو تو موٹی سی بات ہے کہ آدمی
جو کچھ سنتا ہے یا دیکھتا ہے وہی سیکھتا ہے۔ اس لیے یقینی ہے کہ بُری باتیں
کان میں پڑیں گی تو بُری باتیں سیکھو گے، اچھی باتیں سنو گے تو اچھی باتیں
سیکھو گے۔ مقصد اس تمام تقریر کا یہ ہُوا کہ غصّہ اور نفرت کو نفی کرنے سے
قوتِ برداشت بڑھتی ہے جو دنیوی، دینی اور روحانی ترقی کے لیے ناگزیر
اور اعلیٰ ترین کردارِ انسانی پیدا کرنے کے لیے ایک اہم ترین صفت ہے۔
قوتِ برداشت کیوں ایک اہم ترین صفت ہے؟ اس لیے کہ یہ انسان
کی عقل کو ایسے نازک سے نازک موقعوں پر محفوظ اور قائم رکھتی ہے جبکہ جذبات
کا تلاطم برپا ہوتا ہے۔ جن کی عقل جذبات سے مغلوب ہو جاتی ہے اُن سے
اضطراراً ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں جو اُن کی اور اُن کے خاندان کی تباہی
کا باعث ہوتی ہیں اور مُعاشرہ میں بھی فساد برپا کرتی ہیں۔ انسان کی فضیلت
اور شرافت دُوسری مخلوق پر صرف عقل کی وجہ سے ہے۔ اس لیے جب انسان
جذبات سے مغلوب ہو جائے اور اس کی عقل جاتی رہے اس وقت وہ ارذل
المخلوقات ہوتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جذبات بُری یا بیکار شئے
ہیں۔ جذبات نہ ہوں تو عمل ساقط ہو جاتا ہے۔ دُنیا میں جو کچھ ترقی اور چہل
پہل نظر آتی ہے یہ سب جذبات ہی کی کارفرمائی ہے لیکن جذبات اُس
وقت تک مفید اور کارآمد ہوتے ہیں جب تک عقل کی پاسبانی اور رہنمائی
میں رہیں۔ مثال کے طور پر محبت ہی کے جذبے کو لیجئے۔ یہ کتنا پاک اور
شریفانہ جذبہ ہے۔ یہ نہ ہو تو دُنیا میں امن و امان ہی قائم نہیں رہ سکتا۔ امن و امان

تو رہا ایک طرف، نوعِ انسان اور دُوسری مخلوق کی پیدائش اور بقا بھی اسی جذبہ سے ہے۔ والدین خصوصاً ماں کو جو محبت اپنے بچّوں کے ساتھ ہوتی ہے اسی کی وجہ سے وہ سو تکلیفیں اُٹھا کر ان کو پرورش کرتی ہے۔ حیوانات میں بھی ہر مادہ اپنے بچّوں کو محبت ہی کی وجہ سے پالتی ہے۔ محبت نہ ہو تو تمام مخلوق کی نسلیں تباہ ہو کر رہ جائیں لیکن یہی محبت کا جذبہ اگر عقل کی رہنمائی سے محروم ہو جائے تو ایک کمینہ جذبہ بن کے رہ جاتا ہے۔ زنا جیسا جُرم اور گناہ جس کا کوئی کفّارہ ہی نہیں ایسی ہی حالت میں سرزد ہوتا ہے جبکہ جذبہ ہی جذبہ باقی رہے اور عقل جاتی رہے۔ زنا کے بُرے نتائج جو زانی اور معاشرے کو بھگتنے پڑتے ہیں ان کا خیال کرنے سے عقل مندوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جتنے قتل زنا کی وجہ سے ہوتے اور جتنے گھر اس کی وجہ سے اُجڑتے ہیں اور کسی وجہ سے برباد نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ اگر پاکبازی بھی باقی رہے تو یہی جذبۂ محبت جب اپنی حد سے بڑھ کر عشق بن جاتا ہے اور عشق بھی جب اوسط سے زیادہ ہو جائے تو جنون اور پاگل پن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایسے عشق سے نہ عاشق کو کوئی فائدہ ہوتا ہے نہ محبوب کو۔ انجام رسوائی اور تباہی کے سوائے اور کچھ نہیں ہوتا۔

اسی طرح غیرت کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ بھی بے انتہا شریفانہ ہے۔ اگر جذبۂ غیرت نہ ہو تو انسان اپنی عورتوں کی عصمت اور اپنے خاندان اور مذہب کی عزت کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ لیکن اس جذبہ کے سَر سے بھی جب عقل کا سایہ اُٹھ جاتا ہے تو لوگ ذرا ذرا سی فضول رسموں، بیکار باتوں اور بے بنیاد شبہات پر ایک دُوسرے کے گلے کاٹنے لگتے ہیں۔ ایسی حمیت و غیرت کی ایک مثال وراثتی انتقام ہے جبکہ ایک شخص اپنے باپ یا دادا کے قتل کا بدلہ قاتل کے

بیٹے یا پوتے کو قتل کر کے لیتا ہے حالانکہ وہ بالکل معصوم اور بے گناہ ہوتے ہیں۔ ایسی غیرت کو مذہب نے الحمیۃ الجاہلیت کے نام سے یاد کیا ہے۔ اللہ تعالےٰ ہمارے معاشرے کو اس شر سے پاک فرمائے۔ آمین

الغرض کسی جذبہ کی تحلیل نفسی کیجئے اور کسی پہلو سے دیکھئے نتیجہ یہی نکلے گا کہ جذبات جب تک عقل کے تابع رہیں مفید اور تعمیری رہتے ہیں۔ جہاں عقل کی پاسبانی سے محروم ہوئے تخریبی اور تباہ کن بن جاتے ہیں۔ میری اس تقریر سے آپ کو یہ سیکھنا چاہیئے کہ جذبات کو ہمیشہ قابو میں رکھیں اور عقل کی روشنی میں ان سے کام لیں۔ مگر یہ بھی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ صبر یعنی برداشت کی قوت آپ کے اندر بدرجۂ اولیٰ پیدا نہ ہو جائے۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْن کا یہی مطلب ہے کہ اللہ انہی کے ساتھ ہے جو قوت برداشت رکھتے ہیں اور عقل کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔

اعلیٰ کردار و اخلاق پیدا کرنے کے لیے اور بھی کئی صفات ضروری ہیں مگر میں یہاں صرف دو باتوں کا ذکر کروں گا۔ اگر یہ دو باتیں پیدا کر لی جائیں تو باقی محاسن اخلاق خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ دو باتیں یہ ہیں: ایک وقت اور وعدے کی پابندی، دوسرے انکساری۔

میں اپنے اہلِ حلقہ کا اکثر جائزہ لیتا رہتا ہوں اور اس وقت یہ بیان کرنے میں مجھے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ الحمد للہ ہمارے حلقہ والوں کا اخلاق عام مسلمانوں سے کہیں افضل و اعلیٰ ہے۔ میں نے اکثر آدمیوں کو ان کے اخلاق کی تعریف کرتے سُنا ہے۔ خصوصاً جب ہمارا کوئی بھائی بُرائی کا بدلہ نیکی اور گالیوں کا جواب مُسکراہٹ اور دُعا سے دیتا ہے تو سننے والے یہی کہتے ہیں۔ کہ "سبحان اللہ اس زمانے میں بھی ایسے مسلمان باقی ہیں"۔ مگر

ایک بات کو دیکھ کر مجھے بہت افسوس اور دُکھ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اہلِ حلقہ میں اکثر آدمی ایسے ہیں جو وقت اور وعدے کی پابندی بالکل نہیں کرتے۔ تاہم مجھے اعتراف ہے کہ ہمارے فوجی بھائی فوجی تربیت کی وجہ سے وقت کی پابندی تو کرتے ہیں لیکن وعدے کے پابند تو ان میں بھی بہت کم لوگ ہیں۔ سول والوں کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ نہ تو وقت کے پابند ہیں نہ وعدے کے الّا ماشاءاللہ۔ وقت اور وعدے کی پابندی کردارِ انسانی کی عمارت میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نہ ہو تو اور خوبیوں پر بھی پانی پھر جاتا ہے۔ وقت کی پابندی سے انضباطِ عمل پیدا ہوتا ہے جس کے بغیر کوئی سکیم اور کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پانچ وقت کی نماز بہ آوازِ بلند آپ کو پکار پکار کر پابندیٔ وقت کا سبق یاد دلاتی ہے لیکن جو لوگ وقت پر نماز ہی ادا نہیں کرتے اُن سے کیا اُمید ہو سکتی ہے کہ اور کاموں میں وقت کی پابندی کریں گے۔

برادرانِ حلقہ! جو آدمی وقت کا پابند نہیں ہوتا وہ قدرتاً اپنے اعمال و افعال میں سُست ہوتا ہے اور سستی خدا کو بہت ہی ناپسند ہے۔ وہ سُست آدمیوں کے کاموں میں کبھی برکت نہیں دیتا۔ اس لیے آپ اچھی طرح دِل میں بٹھا لیجئے کہ وقت کی پابندی نہ کر کے آپ اپنی دُنیا کا بھی نقصان کرتے ہیں اور دین کا بھی۔

وعدے کی پابندی بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ حلقہ کی تعلیم میں صداقت کا اختیار کرنا ایک ضروری شرط ہے اور اس پر آپ سے بیعت بھی لی جاتی ہے۔ طریقت توحیدیہ میں جسمِ انسانی کے ہر عضو کی صداقت کا مفصل بیان کر کے بتایا گیا ہے کہ زبان کی صداقت یہ ہے کہ کبھی جھوٹ نہ بولو۔ اب آپ خود ہی سوچیں کہ کسی سے وعدہ کر کے پورا نہ کرنا جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے۔ جھوٹ ایک کبیرہ گناہ ہے۔ کبیرہ گناہ کر کے یہ اُمید رکھنا کہ آپ کو خدا کا قرب میسر آئے گا،

کس قدر قابل مضحکہ بات ہے۔ ایفائے وعدہ کے متعلق بھی قرآن میں نص صریح موجود ہے۔ اوفوا بالعہد ان العہد کان مسئولا۔ (وعدہ پورا کیا کرو۔ قیامت کے دن اس کی بابت پوچھا جائے گا) اس نص صریح کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ اُمید رکھنا کہ آپ ولی اللہ بن جائیں گے انتہائی خود فریبی ہے۔ تعمیر ملت اور طریقت توحید یہ میں یہ سب لکھا ہُوا ہے لیکن آپ نہ یہ پڑھتے ہیں نہ وہ۔ براہ کرم دونوں کتابوں کی ایک ایک جلد لازماً اپنے پاس رکھیں اور روزانہ تھوڑا بہت پڑھا کریں اور جو لکھا ہے اس پر عمل کریں۔

انکساری بھی تعمیر کردار کے لیے ایک بہت ہی اہم صفت ہے۔ مگر جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں۔ انکساری کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ اپنے آپ کو دُوسروں سے ذلیل و حقیر سمجھیں۔ ایسا خیال کرنا بھی انتہائی دنائت اور غلامانہ ذہنیت کی علامت ہے۔ ایسی ذہنیت کے لوگ شرافت سے بالکل معریٰ ہوتے ہیں ان کا کردار کبھی بھی اعلیٰ درجے کا نہیں بن سکتا۔ ایسے لوگوں میں بہت سی کمینہ خصلتیں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ خوشامدی چغل خور اور اوّل درجے کے بے غیرت ہوتے ہیں۔ دُوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ان کو شرم محسوس نہیں ہوتی اور جب یہ عادتیں دِل میں گھر کر لیتی ہیں تو بھیک مانگنے اور چوری کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ آپ کا پہلا شرف یہ ہے کہ آپ انسان ہیں اور دُوسرا شرف یہ ہے کہ آپ مسلمان ہیں (بشرطیکہ آپ اسلام کی تعلیم پر عمل بھی کرتے ہوں) ان دو شرافتوں کے ہوتے ہُوئے اپنے آپ کو حقیر و ذلیل سمجھنا کسی طرح بھی جائز و مناسب نہیں۔

انکساری یہ بھی نہیں ہے کہ آپ لوگوں سے بات کرتے وقت مسمسا منہ بنا لیں اور آنکھیں جھکا کر عاجزی سے بات کریں اور جس سے باتیں کر رہے ہیں اُس کو اپنے سے حقیر و ذلیل سمجھتے ہوں۔ یہ تو ظاہر داری بلکہ ریاکاری ہے۔

انکساری تو یہ ہے کہ آپ کے دِل میں غرور و تکبر بالکل نہ ہو۔ دِل سے دُوسروں کی عزّت کریں۔ خاطر داری اور تواضع سے پیش آئیں اور کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے دُوسروں کی دِل شکنی ہوتی ہو۔ غرور و تکبّر انسان کو دُوسروں کی نظر سے گرا دیتا ہے اور لوگ کسی ظاہری لالچ یا خوف سے اس کی تعریف ہی کیوں نہ کریں دِل سے اس کو اچھا نہیں سمجھتے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس کو پڑھ کر شاید آپ کے دِل میں یہ اعتراض پیدا ہو کہ اللہ تعالےٰ تو فرماتا ہے کہ ہم نے تم میں سے بعض آدمیوں کو دُوسرے آدمیوں پر فضیلت دی ہے تو جن لوگوں پر خدا نے ہم کو فضیلت دی ہے ان کو ہم اپنے سے حقیر و ذلیل کیوں نہ سمجھیں۔ یہ خیال اور اعتراض بالکل غلط ہے۔ کسی کو حقیر و ذلیل سمجھنا اور بات ہے لیکن کسی کو اپنے سے کمتر یا برتر جاننا بالکل دُوسری بات ہے۔ فضیلت کی بہت سی چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں مثلاً جسمانی طاقت، خوبصورتی، دولت، منصب، علم، حکومت، بزرگی اور اتقا وغیرہ۔ تو ان چیزوں میں اگر آپ کو کسی پر یا کسی کو آپ پر فضیلت حاصل ہے تو اس قسم کی فضیلت کو ضرور ماننا چاہیئے اور جتنی کسی کو فضیلت حاصل ہو اتنا ہی اس کا ادب اور پاس و لحاظ کرنا چاہیئے اور جن چیزوں میں اللہ نے آپ کو دُوسروں پر فضیلت عطا فرمائی ہے اس کا صحیح احساس و عرفان بھی آپ کو ہونا چاہیئے۔ یہی نہیں بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر اگر آپ کسی سے اس کا ذکر بھی کریں تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ عین منشائے خداوندی کے مطابق ہے۔

یہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس کا فائدہ آپ کو اسی حالت میں ہو سکتا ہے جبکہ آپ ان باتوں پر عمل کریں ورنہ اس کان سننے اور اُس کان اُڑا دینے سے تو کبھی بھی کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

آیئے اب دُعا کریں کہ اللہ تبارک تعالےٰ ہم سب کو اخلاق حسنہ کی دولت سے مالا مال فرمائے اور صراطِ مستقیم پر چلائے۔ آمین

لاہور
۲۴ر اپریل ۱۹۶۵ء

خادم الخدام
عبدالحکیم انصاری

(۵)

کیا یہ خوشی اور مسرت کی بات نہیں کہ ہم میں سے بہت سے بھائی آج پورے ایک سال بعد پھر ایک جگہ اکٹھے ہوئے ہیں تاکہ سال بھر میں جو میل کچیل دل پر جم گیا ہے اُس کو صاف کر کے اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے اپنی محبت اور اپنے روابط کو پھر استوار اور تازہ کریں؟ کیا یہ وقت اللہ کی حمد و ثنا اور شکر گذاری کا نہیں جس نے پھر یہ موقع عطا فرمایا۔ ہے اور ضرور ہے۔ لہٰذا آیئے پہلے حمد و ثنا کریں اور اس کا شکر بجا لائیں پھر رسولِ کریم پر درود بھیجیں کہ حضورؐ ہی کے صدقہ اور توسل سے یہ سب کچھ ہم کو عطا کیا گیا ہے۔

سال گذشتہ ہمارا اجتماع لاہور میں ہوا تھا۔ اس موقعہ پر چوہدری جلال الدین صاحب نے اس سال کا اجتماع نوشہرہ ورکاں میں منعقد کرنے پر اس قدر خلوص و دل گیری سے اصرار کیا کہ انکار کرتے نہ بن پڑا۔ اور اُسی وقت یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ ۱۹۶۶ء کا اجتماع نوشہرہ ورکاں میں ہوگا۔ اسی لیے آج ہم سب یہاں موجود ہیں۔ میں چوہدری صاحب اور ان کے رفقائے کار کا دلی شکریہ اپنی اور پورے حلقۂ توحید کی طرف سے ادا کرتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک تعالےٰ ان سب کو دین اور دُنیا دونوں میں ہر لحاظ سے کامیاب فرمائے۔ آمین۔ ساتھ ہی میں تمام

شرکائے جلسہ کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی تشریف آوری سے اجتماع کو رونق بخشی۔

برادرانِ حلقہ! آپ جانتے ہیں کہ دُنیا میں خوشی اور غم کا چولی دامن کا ساتھ ہے ہمارا حلقہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اور میں مجبور ہوں کہ اس خوشی کے موقعہ پر کچھ غم کی خبریں بھی آپ کو سناؤں۔

پہلی خبر تو یہ ہے کہ پچھلے سال عین اجتماع سے ایک دِن پہلے میری اہلیہ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ دُوسری خبر یہ ہے کہ ہمارے حلقہ کے ایک بہت ہی نیک اور صالح نوجوان اور ہمارے بہت ہی پیارے بھائی محمد لطیف کمانڈو نے ہم سب کو اور اپنے ضعیف والدین اور بیوی بچوں کو داغ مفارقت دیا۔ ان کے علاوہ لاہور کے جناب محمد یعقوب بھٹی کے والد۔ پشاور کے منظور الحق صاحب کے والد۔ ڈرگ روڈ کے سرجنٹ علی کے والدین اور بشیر مرزا اور عنایت مرزا کے والد صاحب نے انتقال فرمایا۔ میں اپنی اور اپنے حلقہ کی طرف سے ان سب متوفیان کی رحلت پر اظہارِ غم و تعزیت کرتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک تعالیٰ ان سب متوفیان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

برادرانِ حلقہ: یہ ہمارا آٹھواں سالانہ اجتماع اور پانچواں خطبہ ہے۔ پہلے خطبہ سے چوتھے خطبہ تک میں نے یہ التزام کیا تھا کہ وہ تصوّف و سلوک کی ابتداء سے انتہا تک مسلسل ہوں تا کہ طالبانِ تصوّف و سلوک سب کو ملا کر پڑھنے سے پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ پانچواں خطبہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس خطبہ میں مَیں نے راہِ سلوک کی رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ ان پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ ہتھیلی پر سرسوں

جمانا نہیں چاہتے اور واقعی سلوک کو مکمل کرنا چاہتے ہیں اور جو رکاوٹیں اس راہ میں پیش آتی ہیں ان کو دُور کرنے کے لیے جدوجہد کرتے اور کچھ تکلیفیں اٹھانے کے لیے تیار ہیں وہ یقیناً اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں گے انشاءاللہ العزیز۔ میری رائے میں یہ خطبہ سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ ذکر اور عبادت تو ہر شخص شروع کر سکتا اور کر لیتا ہے اور شیخ کامل کی توجہ سے اُس کو ذکر وغیرہ میں لُطف بھی آنے لگتا ہے۔ گرمی، سرور اور نشہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جب اُس کی راہ میں کوئی رکاوٹ آجاتی ہے تو وہ گھبرا جاتا ہے اور رکاوٹ زیادہ سخت ہو تو گھبرا کر ذکر وغیرہ چھوڑ دیتا ہے یا کم از کم اتنا تو ضرور ہوتا ہے کہ اُس کا سکون دماغ ختم ہو جاتا ہے اور ذکر میں وہ لذت نہیں آتی جو پہلے تھی۔ اس موقعہ پر ہزاروں سالکانِ راہِ طریقت میں سے دو چار ہی مرد میدان ہوتے ہیں جو ثابت قدم رہتے ہیں ورنہ باقی سب میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ ایسے موقعہ پر کئی ایسے آدمی بھی ہوتے ہیں جو پیر سے مدد چاہتے ہیں کہ یا تو وہ رکاوٹوں کو اپنی کرامت سے دُور کر دے یا خود اُن میں اپنی ہمت باطنی اور توجہ سے اتنی طاقت پیدا کر دے کہ وہ رکاوٹ پر غالب آجائیں لیکن کوئی پیر کامل ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں کرتا بلکہ ان کو رکاوٹ پہ غالب آنے کا صرف راستہ بتا دیتا ہے۔ وہ مدد کیوں نہیں کرتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح پیر کی مدد سے جو لوگ سلوک طے کرتے ہیں اُن میں اُن کی اپنی ذاتی طاقت کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ اپنے پاؤں پر خود کبھی کھڑے نہیں ہوتے۔ ہمیشہ پیر کے کندھے کا سہارا لے کر چلنے کے عادی ہوتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہوتا ہے سب پیر ہی کا ہوتا ہے۔ اس لیے جب کبھی پیر کی طرف سے مدد نہیں ملتی یا پیر فوت ہو جاتا ہے تو اُن

کی قوت ختم ہو جاتی ہے اور وہ کورے کے کورے رہ جاتے ہیں۔
موٹی عقل کا آدمی بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ دُنیا کا کوئی سا بڑا کام بھی بغیر سخت محنت اور مجاہدے کے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ دنیوی امور میں تو منزلِ مقصود کا علم ہوتا ہے اور اس تک پہنچنے کے ذرائع بھی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دُوسری بات ہے کہ کوئی شخص ان ذرائع تک دسترس حاصل نہ کر سکے اور جو لوگ محنت اور عقل سے ان ذرائع کو حاصل کر لیتے ہیں وہ سو فی صدی کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن سلوک میں یہ بات نہیں ہے۔ سلوک کی آخری منزل اور مقصد خدا کا قرب، دیدار اور معرفت حاصل کرنا ہے۔ لیکن خدا نہ تو دکھائی دیتا ہے نہ سمجھ میں آ سکتا ہے نہ اُس تک پہنچنے کے ذرائع ہی سالک کے علم میں ہوتے ہیں۔ اس لیے منزلِ مقصود تک پہنچنا اس وقت تک محال ہوتا ہے جب تک کوئی سچا رہنما اور رہبر نہ ہو۔
اور رہنما اور رہبر صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو خود منزلِ مقصود تک پہنچ چکا ہو اور راستہ کے اُتار چڑھاؤ اور پیچ و خم سے خوب واقف ہو۔ لیکن ایسے رہنما اور رہبر سے بھی پورا فائدہ وہی اُٹھا سکتے ہیں جو سچے طالب ہوں۔ جن کی طلب اس قدر پختہ اور شدید ہو کہ منزل و مدعا تک پہنچنے کے لیے ہر طرح کی تکلیف خندہ پیشانی سے اٹھا سکیں اور کتنی ہی مصیبتیں پڑیں اُن کے عزم و استقلال میں کمی نہ آئے۔
(۱) اس لیے سب سے پہلی رکاوٹ جو راہِ سلوک میں پیش آتی ہے طلب کی خامی اور کمی ہے۔ یوں سمجھنے کو تو ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ میری طلب صادق اور میرا عزم راسخ ہے لیکن یہ اس کی بھول ہوتی ہے۔ طلبِ صادق کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ راہ کی کسی دشواری کو خاطر میں نہ لائے اور ہمیشہ آگے ہی بڑھتا رہے۔ میدانِ جنگ میں غازیوں اور مجاہدوں کا خیال کرو۔ ان کا مقصد دشمن کے مورچوں پر قبضہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے جب وہ حملہ کرتے ہیں تو

اگرچہ میدان میں گولوں اور گولیوں کا مینہ برستا ہوتا ہے۔ اور ایک انچ جگہ ایسی نہیں ہوتی جہاں گولیاں نہ برس رہی ہوں۔ لیکن جب وہ ارادہ کر لیتے ہیں تو اسی مینہ میں آگے بڑھتے ہیں۔ گرتے ہیں۔ زخمی ہوتے ہیں۔ شہید ہوتے ہیں لیکن اُن کے قدم پیچھے نہیں ہٹتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دشمن کے مورچوں پر قبضہ کر لیتے ہیں اور اُس کی توپوں کو خاموش کر دیتے ہیں۔ یہ گولے اور گولیاں تو نظر آتی ہیں لیکن راہِ سلوک کے مجاہد کو جن گولے اور گولیوں کی بارش میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ نظر نہیں آتیں۔ صرف محسوس ہوتی ہیں۔ یا سمجھ میں آسکتی ہیں۔ اس لیے اگر ارادہ اٹل اور طلب ناقابلِ شکست نہ ہو تو یہ لوگ چار چھ قدم ہی چل کر اپنے مورچوں میں واپس آجاتے ہیں اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہتے ہیں۔ اس لیے جب تک طلب کامل اور عزم راسخ نہ ہو کسی کو بھی اس راہِ پُرخطر میں قدم نہیں رکھنا چاہیئے ورنہ وہی مثل ہوگی کہ ؎

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

(۲) اس راستہ کی دُوسری رکاوٹ یہ ہے کہ سالک کو پیرِ کامل سے مرید ہونے کے باوجود اس سے والہانہ عقیدت نہ ہو یا وہ اُس کی اطاعت یا ادب کرنے میں کمی کرے۔ ان تین باتوں کے متعلق تعمیرِ ملّت اور طریقت توحیدیہ میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے اور کسی خطبہ میں بھی غالباً بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے یہاں بہ خوفِ طوالت زیادہ بیان نہیں کر سکتا۔ صرف اتنا کہتا ہوں یہ تین باتیں قصرِ سلوک کی بنیاد ہیں۔ اگر ان میں ذرا بھی قصور ہوا تو یہ قصرِ فلک بوس کسی وقت بھی زمین پر گر کر مٹی میں مل جائے گا۔ سچی عقیدت یہ ہے کہ پیر کے کمال میں ذرا سا شبہ بھی کبھی دِل میں نہ آنے پائے اور اس کے متعلق کسی بُرائی کا گمان بھی نہ ہو۔ عقیدت میں پیر سے محبت کا امتزاج بھی بے انتہا ضروری ہے۔ خشک عقیدت

سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ اطاعت یہ ہے کہ پیر کا ہر حکم خواہ وہ بہ امتثال امر ہو یا بہ سبیلِ تذکرہ آنکھ بند کر کے خوشی سے پورا کیا جائے خواہ اس کے منافع اور مصالح سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں۔ ادب یہ ہے کہ پیر خواہ موجود ہو یا غائب اس کا تھوڑا سا خوف اور زیادہ سے زیادہ محبت و عزّت دِل میں موجود رہے ۔مرید اس کی کوئی ذراسی بُرائی بھی کانوں سے نہ سُن سکے اور ایسی جگہ سے فوراً دُور چلا جائے۔ پیر کی موجودگی میں بات زیادہ نہ کرے اور بات کرے تو آواز بلند نہ ہو۔ ہنسنا قہقہے لگانا۔ پیر کی مجلس میں پاؤں پسار کر بیٹھنا یا لیٹ جانا سخت بے ادبی ہے۔ پیر سے زیادہ سوالات کرنا بھی ادب کے خلاف ہے۔ پیر اگر بے تکلفی سے بھی پیش آئے تو خود ہرگز بے تکلف نہیں ہونا چاہیئے ۔ الغرض! کوئی بات بھی تمیز و تہذیب کے خلاف نہ ہونی چاہیئے ۔

(۳) تیسری رکاوٹ ماحول ہے۔ ماحول سے مُراد ہے اپنا گھر، ہمسائے، محلہ اور وہ لوگ جن کی صحبت میں سالک رہتا ہے ۔ اگر گھر میں ہر وقت شور و غل، لڑائی جھگڑا رہتا ہو تو سالک کو وہاں سکون کے ساتھ ذکر کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ محلے کے لوگ اگر بد اخلاق ہوں، لڑتے جھگڑتے ہوں، گالیاں بکتے ہوں تو اُن کا اثر بھی ضرور پڑتا ہے اور ذکر و عبادت سے جو تھوڑا بہت سکون ملتا ہے وہ زائل ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح جن لوگوں کی صحبت میں سالک رہتا ہے اگر وہ بد چلن، بد اخلاق اور بد خو ہوں تو سالک ان سے بھی اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اگر سالک اللہ کے راستہ پر کامیابی سے چلنا چاہتا ہے تو لازم ہے کہ ایسے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر کے اچھے اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرے اور ممکن ہو تو وہ محلہ اور گھر بھی بدل دے ۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو کسی مسجد وغیرہ میں ایسا گوشۂ عافیت دریافت کرے جہاں ذکر سکون سے ہو سکے ۔ ذکر جب پختہ ہو جاتا

ہے تو گھر اور محلہ وغیرہ کے مخالف حالات کا اثر سالک کی طبیعت پر نہیں پڑتا
بلکہ خود اس کا اثر لوگوں پر پڑنے لگتا ہے۔ لیکن جب تک ذکر پختہ نہ ہو اور اس کا
اثر سالک کی رگ و پے میں سما نہ جائے اس کو مخالف ماحول سے دُور رہنا ہی
لازم ہے۔ مختصر یہ کہ جس بات، جس چیز یا جس آدمی کی وجہ سے اُس کے ذکر اور خدا
کی یاد میں ذرا سا بھی مخالف اثر پڑتا ہو اس کو چھوڑ دے اور یہ یاد رکھے کہ نہ
اس دُنیا میں کوئی کسی کے کام آتا ہے نہ آخرت ہی میں کچھ مدد کر سکتا ہے۔ یہ صرف
خدا کی ذات ہی ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتی ہے۔ خدا ہی اس دُنیا میں اس
کی مدد کرتا ہے اور خدا ہی مرنے کے بعد اس کے ساتھ ہوگا اور اس کی مدد کرے گا۔

(۴) چوتھی رکاوٹ **عُسرت و غربت** ہے۔ آمدنی کم ہے اہل وعیال کثیر ہیں
پھر برادری اور کنبہ کی لغو اور خلاف اسلام و انسانیت رسوم جن میں خرچ نہ کرو
تو ناک کٹتی ہے۔ یہ فضول رسمیں پوری کرنی ہی پڑتی ہیں خواہ قرض لینا پڑے۔
رشتہ داروں اور ملنے والوں میں کئی امیر بھی ہوتے ہیں جو اچھا کھاتے اچھا پہنتے
ہیں۔ موٹروں میں پھرتے ہیں ان کو دیکھ کر کڑھنا اور رنج کرنا۔ بچوں اور بیوی کی
شکایات کہ ہمارے پاس یہ نہیں ہے وہ نہیں ہے فلاں کے پاس تو سب کچھ ہے۔
ہمارے لیے بھی ایسا ہی مکان لو۔ ایسے ہی کپڑے اور زیور وغیرہ بناؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔
یہ رکاوٹ بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر سالک اس پر غالب نہ آسکے تو پھر وہ کسی
طرح بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس رکاوٹ کا علاج **قناعت** ہے۔ قناعت کا
مطلب یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے تم کو دے رکھا ہے اس پر تمہارا دِل خوش
رہے۔ کبھی شکایت کا جذبہ پیدا نہ ہو بلکہ جذبات شکر و سپاس سے تم ہمیشہ
مسرور رہو۔ بظاہر یہ بات بالکل ناممکن نظر آتی ہے کہ غربت و نکبت میں
بھی انسان ایسا ہی خوش رہے۔ جیسے دولت و ثروت میں رہتا ہے لیکن فکر صحیح

اور مشاہدۂ وسیع سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ بات ناممکن تو کیا کچھ زیادہ دشوار بھی نہیں ہے۔ جن لوگوں کی طلب صادق اور ارادہ پکا ہوتا ہے وہ بہت آسانی سے ان تمام پریشانیوں پر قابو پا لیتے ہیں۔ حضور رسولِ کریمؐ کی زندگی کا مطالعہ کرو۔ غریبی ہی حضورؐ کا طغریٰ امتیاز تھی۔ اصحاب کبار میں زیادہ تر غریب ہی تھے۔ اصحاب صفّہ تو سب کے سب ہی نہایت غریب اور مسکین تھے۔ اولیائے کرام میں لاکھوں ایسے گزرے ہیں۔ جن کو کئی کئی دن میں ایک وقت پیٹ بھر کھانے کو ملتا تھا۔ پھر اُن کے پاس نہ مکان تھا۔ نہ اچھا لباس۔ مگر یہی وہ لوگ تھے جو آسمانِ ولایت پر مہر درخشاں بن کر چمکے۔ وہ سب انسان تھے۔ آپ بھی انسان ہیں۔ جو کچھ اُنھوں نے کیا آپ بھی کر سکتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ جو لوگ غربت اور مفلسی کی تکالیف کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں ان کی طلب صادق نہیں۔ مگر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ بڑے طالب صادق ہیں۔ ہمارے دوستوں میں سے کئی ایسے موقع پر کہتے ہیں کہ اگر میں اکیلا ہوتا اور بیوی بچے نہ ہوتے تو یہ سب مصیبتیں برداشت کر لیتا۔ مگر ان کو کیا کروں۔ ان کی تکالیف مجھ سے نہیں دیکھی جاتیں۔ مگر ایسا کہنے والے یہ نہیں سوچتے کہ اگر تم اکیلے ہوتے اور یہ تکالیف بہ طیب خاطر برداشت کر لیتے تو کمال ہی کیا تھا۔ یہ تو ہر شخص کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تو تمہاری آزمائش ہی اس طرح کرنی تھی۔ کہ بیوی اور بچوں کی تکالیف دیکھو اور تمہارے پائے ثبات میں لغزش نہ ہو۔ اور میدان طلب میں اسی طرح ڈٹے رہو اور آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ افسوس یہ سب بہانے ہیں۔ طلب صادق کا ان لوگوں میں نام و نشان بھی نہیں۔ خود بھی دھوکے میں ہیں۔ اور اپنے شیخ کو بھی دھوکہ دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو میں یہی مشورہ دوں گا کہ فقر کا نام بھی نہ لیں۔ صرف نماز روزہ کر لیا کریں۔ اور

گھر میں بیٹھے چین سے دُنیا داری کی زندگی بسر کریں اور پھر دیکھیں کہ کیا ان کی غربت و نکبت امارت سے بدل جائے گی۔

قرآن پاک میں اس قسم کی تکلیفوں اور دُوسری مصیبتوں کا علاج یہ بتایا گیا ہے کہ نماز اور صبر سے مدد لو۔ یعنی نماز قائم رکھو اور جو مصیبت پڑے خوشی سے برداشت کرو۔ دُوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر تم اپنی حالت پر خوش نہیں ہو تو پھر ایسا کرو کہ فضا میں ایک رسّی لٹکاؤ اور پھانسی کھا کر مر جاؤ اور پھر دیکھو کہ (کیا مرنے کے بعد) تمہاری تکالیف دُور ہو جاتی ہیں۔ نعوذ باللہ کتنی بڑی اور شدید وعید ہے۔ اگر کوئی آدمی صرف اسی پر اچھی طرح غور کرے تو خدا کی قسم کتنی ہی تنگی و ترشی ہو وہ اس کو خاطر میں نہ لائے گا اور ہمیشہ خوش رہے گا۔ پھر قرآن میں یہ بھی ہے کہ اللہ نے کسی کو نپا تُلا رزق دیا ہے اور کسی کو بے حساب عطا فرمایا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس کسی کے پاس جو کچھ ہے خدا کی مرضی سے ہے۔ تو اے سالکانِ راہِ خدا تم خدا کی مرضی پر خوش کیوں نہیں رہتے اور اس کی مرضی کو اپنی مرضی کے تابع کیوں کرنا چاہتے ہو۔

اس سال کے منشور دعوت میں جو آیت سرورق پر دی گئی ہے اس کو غور سے پڑھو اگر تم اللہ سے دوستی کرنے گھر سے نکلے ہو اور اس کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو تربیت کے لیے طرح طرح کی آزمائشوں میں ضرور مبتلا کیے جاؤ گے۔ اگر یہ بات تم کو پسند نہیں تو جاؤ اپنی ایڑیوں پر اُلٹے واپس لوٹ جاؤ۔ اللہ کا قرب یا اس کی لقا اور معرفت شب برات کا حلوہ نہیں ہے۔

عسرت و غربت سے بددِل ہو جانے کا ایک علاج حضور رسولِ کریمؐ نے یہ بھی بتایا ہے کہ "جب تم کو اپنی غربت و زبوں حالی کی شکایت ہو تو اپنے سے کمتر لوگوں پر نظر کرو"۔ تم کو لاکھوں آدمی ایسے نظر آئیں گے جو تم سے بھی کہیں زیادہ

مفلوک الحال اور محتاج ہیں۔ ان کی حالت سے عبرت حاصل کرو۔ اور خدا کا شکر بجا لاؤ کہ تم بڑے آرام میں ہو۔

سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ میں دمشق میں تھا اور میرے پاؤں میں جوتے نہ تھے ننگے پاؤں پھرنے سے سخت زحمت ہوتی تھی اور دل میں سے یہ شکایت اٹھتی تھی کہ اللہ نے مجھے ایک جوڑا جوتا بھی نہیں دیا۔ اسی حال میں ایک مرتبہ دمشق کی جامعہ مسجد میں گیا تو دیکھا وہاں ایک شخص مسجد کے فرش پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کے دونوں پاؤں ندارد ہیں یہ دیکھ کر مجھے سخت عبرت ہوئی اور میں نے کہا کہ اے اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے دو پاؤں تو دے رکھے ہیں جن سے میں چل پھر لیتا ہوں۔ یہ غریب تو چلنے پھرنے سے بھی معذور ہے"۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد سعدی صاحبؒ کو ننگے پاؤں پھرنے میں کبھی تکلیف محسوس نہ ہوئی ہو گی۔ "تکلیف دراصل محض ایک خیالی شے ہے جو اپنی حالت کا مقابلہ اپنے سے بہتر لوگوں کی حالت سے کرنے سے محسوس ہوتی ہے۔ اسکے سوائے تکلیف کے اور کوئی معنی نہیں ہیں"

عسرت و غربت سے ایک اور بہت بڑا عیب انسان میں پیدا ہو جاتا ہے جس کا نام ہے احساس کمتری۔ یہ ایک ایسی لعنت ہے جو انسان کو ایک سیکنڈ بھی سکون سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ سب سے بڑی خرابی اس میں یہ ہے کہ انسان کو خود یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہے۔ جو بچے اپنے ماں باپ یا بزرگوں کو دوسرے لوگوں کی خوشامد اور خدمت کرتے دیکھتے ہیں یا اپنے والدین اور بڑے بھائیوں سے پٹتے رہتے ہیں یا جن کے دلوں میں اپنے متمول رشتہ دار اور پڑوسی بچوں کے اچھے کھلونے، کپڑے، عمدہ مکانات دیکھ کر یہ امنگیں اٹھتی ہیں کہ یہی چیزیں ہمارے پاس بھی ہوں۔ وہ جب اپنے ماں باپ سے کسی چیز کی فرمائش یا ضد کرتے ہیں اور جواب میں ڈانٹ ڈپٹ سنتے اور

مار کھاتے ہیں تو ان کے دِل ٹوٹ جاتے ہیں۔ اُن کی تمنائیں کچل جاتی ہیں۔ حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور وہ گلاب کے اس پودے کی طرح مُرجھا کر رہ جاتے ہیں جس کو پانی نہ ملا ہو۔ وہ جب بڑے ہوتے ہیں تو بظاہر ان تمام باتوں کو بھول جاتے ہیں لیکن یہ تاثرات ان کے لاشعور میں موجود ہوتے ہیں اور ان کے کردار پہ برابر اثر کرتے رہتے ہیں۔ اب دو صورتیں واقع ہوتی ہیں یا تو وہ غم و الم، حسرت و ارمان اور یاس و نا اُمیدی کا مجسم مرقع بن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قنوطی بن جاتے ہیں اور دینوی مراتب و مناصب حاصل کرنے کا خیال تک بھی دل میں نہیں کرتے یا چند خارجی محرکات و مہیجات سے متاثر ہو کر اپنی جھوٹی نمود و نمائش، شیخی، خود پرستی اور خود نمائی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اب وہ دُوسروں پر اپنی فضیلت کا طرح طرح سے اظہار کرتے ہیں۔ اپنی تعریفیں خود اپنے مُنہ سے کرتے اور اپنی فرضی بڑائیاں خود بیان کرتے پھرتے ہیں۔ کوئی اپنی قوم اور ذات کی بڑائی جتاتا ہے۔ کوئی بیس پشت پہلے کے آباؤ اجداد کے مناصب و مراتب کا ڈھنڈورا پیٹ کر دُوسروں کو مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ کوئی اپنے علم و فضل کی دھاک بٹھاتا ہے۔ اگر اتفاقاً ان میں سے کوئی شاعر ہو جائے تو خدا کی پناہ۔ وہ تو اقبال و غالب کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ کوئی سننا چاہے نہ چاہے وہ اپنا کلام سناتا اور داد چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ ملنے والوں کو راستہ چلتے سڑک پر روک کر زبردستی غزل خوانی کرنے لگتا ہے اور تقاضا کرتا ہے کہ اس کے لچر، لوچ کلام کی ضرور داد دی جائے۔ ایسے لوگوں میں سے اگر کوئی شخص اتفاقاً عربی، فارسی یا انگریزی کی دس پانچ کتابیں اُلٹی سیدھی پڑھ لے تب تو کہنا ہی کیا۔ ارسطو اور افلاطون کی بھی شامت آجاتی ہے۔ وجہ بے وجہ موقع بے موقع جہاں چار آدمی جمع ہوئے یہ ان کو لیکچر جھاڑنے اور

اپنی علمی فضیلت کا رعب بٹھانے لگتا ہے۔ سننے والے لحاظ مروت اور خوش خلقی کی وجہ سے اس کی باتیں سنتے اور بعض اوقات داد بھی دیتے ہیں۔ لیکن اس طرح یہ لوگ اور بھی گمراہ ہو جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسد کہ وہ اُن بزرگوں کو بھی اپنے سے کمتر اور حقیر سمجھنے لگتے ہیں جو حقیقی معنوں میں اچھے شاعر اور واقعی عالم و فاضل ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ احساس کمتری کے شکار ہمیشہ اپنے متعلق خوش فہمی اور جہل مرکّب میں مبتلا رہتے ہیں اور کبھی بھی صحیح معنوں میں ایک بڑا آدمی اور عظیم انسان نہیں بن سکتے۔

اس مہلک مرض کا صرف یہی علاج ہے کہ ان لوگوں پر ان کی صحیح ذہنی، علمی اور اخلاقی حالت کو واضح کر دیا جائے۔ لیکن جو شخص ایسا کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ اس سے لڑ پڑتے ہیں اور اس کو اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لیے ان کا علاج نہیں ہو سکتا۔ روحانی طور پر ان کا علاج صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ کافی عرصہ تک اپنے شیخ کی صحبت میں رہیں۔ اس کی ہر بات کو بے چون و چرا صحیح مان لیں اور وہ جو کچھ حکم دے اس پر اندھوں کی طرح عمل کریں۔ لیکن ان کا اصل علاج تو اس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ان سے بے پناہ اور سچی محبت کرے اور جب وہ اُس کی محبت کا یقین کرنے لگیں اور اس کو اپنا حقیقی خیر خواہ سمجھنے لگیں تو رفتہ رفتہ ان کی خامیوں اور عیبوں کو بالواسطہ طریقے سے ان پر ظاہر کرے۔ انشاء اللہ ان کی اصلاح ہو جائے گی۔

(۵) پانچویں رکاوٹ دولت و ثروت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دو طرح سے آزماتا ہے۔ ایک مفلسی اور مصیبتیں دے کر دُوسرے دولت اور آرام و آسائش دے کر۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت و ثروت کی آزمائش مفلسی اور غربت کی آزمائش سے کہیں زیادہ کٹھن اور دشوار ہے۔ مفلسی اور غربت میں تو قدرتاً اللہ یاد آتا ہے

اور انسان سب طرف سے مایوس ہو کر اللہ ہی کی طرف جُھکتا اور اسی سے مدد مانگتا ہے جبکہ مال و دولت کی فراوانی اور عیش و آرام کی زندگی میں انسان سرے سے خدا کو بھول ہی جاتا ہے۔ دولت مند انسان گناہوں کے تمام اسباب نہایت آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ پھر اس کے گرد بہت سے خوشامدی اور مفت خورے جمع ہو جاتے ہیں جن کا فائدہ ہی اس میں ہے کہ اس کے لیے گناہوں کے سازوسامان مہیّا کریں مثلاً شراب، جُوا، زنانِ بازاری وغیرہ۔ چوبیس گھنٹے ان خرافات یا روپیہ کمانے کے مشاغل میں گذرتے ہیں خدا کو یاد کرنے کی فرصت اسے کہاں نصیب ہوتی ہے۔ جب حالت یہ ہو اور ہر گھڑی ہر وقت بات بات پر آمنّا وصدّقنا اور جی حضور کہنے والے موجود ہوں تو کبر و غرور کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ اب وہ عام انسانوں کو ذلّت اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ دُوسری طرف مزید دولت کمانے کی دھن میں وہ طرح طرح کے ناجائز وسائل بھی اختیار کرتا اور دِن بدن گناہوں اور بداخلاقی کے جال میں جکڑا چلا جاتا ہے۔ دُنیا کی ہوا و حرص میں جھوٹ بولنا لوگوں کو دھوکے دینا اور دُوسروں کا مال غصب کرنا اس کی عادت بن جاتا ہے۔ اب بتائیے کہ ایسے آدمی کو روحانیت اور بزرگی بھلا کیسے مل سکتی ہے۔ اگر خدائے رحیم و کریم دُنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں آگ کے عذاب ہی سے بچالے تو یہ محض اس کا فضل و کرم ہی ہو گا۔

حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہاں غربت و نکبت سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا علاج یہ بتایا ہے کہ تم اپنے سے کمتر اور زیادہ مفلوک الحال لوگوں پر نظر رکھو وہاں امارت و ثروت کی بُرائیوں سے بچنے کا طریقہ یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اپنے سے برتر اور اپنے سے زیادہ دولت مند لوگوں کو دیکھو اور ان کی زندگی کا بغور مطالعہ کرو تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ مال و دولت کے لحاظ سے تو تمہاری

کوئی خاص حیثیت ہی نہیں ہزاروں لاکھوں آدمی تم سے کہیں زیادہ دولت مند ہیں اور ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی زندگی نہایت پاک وصاف اور ہر عیب سے مبرّا ہے۔ اس طرح ممکن ہے کہ تمہارے دل میں جو کبر و غرور ہے وہ ختم ہو جائے اور تم نیک انسان بن جاؤ۔ دولت و ثروت کی خرابیوں سے بچنے کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ تم خوشامدیوں، چاپلوسوں اور مفت خوروں کی صحبت سے بچو اور ان کو اپنے پاس بھی نہ پھٹکنے دو۔ جس دن سے اس کرۂ ارض پر تمدّن کی بنیاد پڑی ہے اس دن سے آج تک دُنیا کے کسی مُلک اور کسی قوم کا لٹریچر اور تاریخ اٹھا کر دیکھ لو ہر جگہ تم کو یہی نظر آئے گا کہ اس قسم کے بدقماش، حاشیہ نشین اور شوربہ چٹ لوگ امرا کے گرد صرف اپنی ذاتی منفعت کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں ہوتا جو نیکی کی راہ دکھائے یا مصیبت کے وقت کام آئے۔ دولت کی بُرائیوں سے محفوظ رہنے کے لیے دُوسرا قدم یہ اُٹھانا چاہیئے کہ اچھے نیک اور صالح آدمیوں کی صحبت میں بیٹھو۔ کسی کامل بزرگ کی خدمت میں حاضری دیتے رہو تاکہ جو خامیاں پیدا ہوں ان کا ازالہ ہوتا رہے اور دِل پر جو زنگ لگا ہے وہ صاف ہو جائے۔ تیسرا قدم یہ ہے کہ غصّہ اور نفرت کو نفی کرنے کی برابر کوشش کرتے رہو۔ خلقِ خدا سے محبت اور غریب انسانوں کی خدمت کرو۔

اسلام دولت کمانے اور سونے چاندی کے انبار جمع کرنے کو منع نہیں کرتا لیکن وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ تم یہ دولت اپنے ذاتی عیش و آرام کے لیے جمع نہ کرو بلکہ خدا کے لیے قوم کی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے جمع کرو۔ اس روپیہ میں سے تم زکوٰۃ نکالو۔ غریب اقربا، یتامیٰ اور محتاج افراد کی تکالیف کو دُور کرنے کے لیے خرچ کرو اور اس طرح دولت کو غربا پر صرف کرنے کو

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ "اللہ کو قرضِ حسنہ دو"۔ تو جو لوگ اس نیت سے دولت جمع کرتے ہیں اور اسی طرح خرچ بھی کرتے ہیں وہ تو خیر ہی خیر کرتے ہیں اور ثواب ہی ثواب کماتے ہیں۔ اس دولت سے ملکی دفاع کے لیے بڑی بڑی فوجیں کھڑی کرو۔ ان کے لیے جدید ترین قسم کے آلات بہم پہنچاؤ اور ان آلات اور ہتھیاروں کو بنانے کے کارخانے قائم کرو۔ ہمارے امراء اور صنعت کاروں کو یاد رکھنا چاہیئے اور ہر وقت یاد رکھنا چاہیئے کہ جس ملک پر کوئی دشمن قبضہ کرتا ہے اس ملک کے امیروں کی بھی سب دولت چھین لیتا ہے۔ ان کا عیش و آرام مٹی میں مل جاتا ہے اور وہ ذلیل و خوار اور کوڑی کوڑی کے لیے محتاج ہو جاتے ہیں۔

(۶) چھٹی رکاوٹ جذبات ہیں۔ انسان میں بیسیوں قسم کے جذبات پیدا کیے گئے ہیں۔ اچھے بھی اور بُرے بھی۔ سالک کو چاہیئے کہ وہ اچھے جذبات پر عمل کرے اور بُرے جذبات کو کچل کر رکھ دے۔ بُرے جذبات کو قابو میں رکھنے اور کچلنے کے لیے صرف قوتِ ارادی اور قوتِ برداشت پیدا کرنے اور اس کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور طاقت ور بنانے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سلسلۂ توحیدیہ کی تعلیم میں صرف دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ غصّہ کو بالکل نفی کر دو، دوسرے یہ کہ کسی سے نفرت نہ کرو۔ اس کے متعلق "تعمیرِ ملّت"، "طریقت توحیدیہ" اور پچھلے سال کے خطبے میں کافی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ لہٰذا اس کا اعادہ تحصیل حاصل ہے۔ حلقہ کے جو احباب اس پر عمل کرتے ہیں وہی اس کے فوائد کو سمجھ سکتے ہیں لیکن جو بار بار بتانے اور سمجھانے کے باوجود عمل نہیں کرتے ان کو اب پھر وہی بتانا اور کہنا ضیاعِ اوقات ہے۔ مندرجہ بالا رکاوٹوں کے علاوہ دو اور رکاوٹیں قابلِ ذکر اور قابلِ توجہ ہیں۔ ان میں سے ایک غرور ہے دوسری غلط فہمی۔

(۷) انسان جب کوئی اچھا کام کرتا ہے یا کوئی بڑا کارنامہ انجام دیتا ہے تو اس کو فطرتاً ایک گونہ خوشی محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو دوسروں سے قدرے ممتاز محسوس کرتا ہے۔ اس جذبہ کو فخر کہتے ہیں۔ فخر کا جذبہ ہر انسان میں فطرتاً ودیعت کیا گیا ہے۔ اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو کوئی انسان بڑے بڑے کارنامے انجام نہ دے سکتا۔ نہ مجبوروں اور محتاجوں کو مدد دیتا۔ مَیں نے ایک چھوٹی سی آٹھ سال کی بچّی کو دیکھا کہ ایک دِن جب وہ سکول سے آئی تو بہت خوش تھی۔ چہرہ تمتما رہا تھا اور بات بات میں کِھلی جاتی تھی۔ میں نے پوچھا آج کیا بات ہے بہت خوش نظر آتی ہو۔ کہنے لگی آج مَیں نے ایک بہت ہی اچھا کام کیا ہے۔ میرے پوچھنے پر بتایا کہ سکول سے چھٹی ملنے پر جب میں گھر آ رہی تھی تو چوراہے پر ایک عورت کو دیکھا جو بہت ہی بوڑھی، کمزور اور اندھی تھی۔ اس کی بغل میں ایک گٹھڑی اور ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ بار بار سڑک کی طرف بڑھتی لیکن پھر واپس ہو جاتی۔ مَیں نے پوچھا "اماں کیا بات ہے"۔ کہنے لگی بٹیا سڑک کے پار جانا چاہتی ہوں مگر بھیڑ بہت ہے"۔ میں نے گٹھڑی ہاتھ میں لی اور لاٹھی پکڑ کر سڑک کے پار پہنچا دیا۔ اس نے کہا بیٹیا میرا گھر نزدیک ہی ہے اگر وہاں تک پہنچا دے تو بڑا احسان ہو گا اس پر میں نے اُس کو اس کے گھر کے دروازے تک پہنچا دیا۔ اس بڑھیا نے مجھے اتنی دُعائیں دیں کہ آج تک کسی نے بھی نہیں دیں۔ اسی وجہ سے آج میرا دِل بہت خوش ہے۔

مَیں یہ سطور لکھ ہی چکا تھا کہ پوسٹ مین ڈاک لایا۔ سب سے پہلا خط جو کھولا تو اس میں بھی ہو بہو یہی مضمون تھا۔ یہ خط حلقہ کے ایک دوست نے بھیجا تھا۔ لکھا تھا کہ "آج ایک نیک کام کیا جس سے دِل بہت خوش ہوا۔ میں سائیکل پر آ رہا تھا دُور سے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی سفید پوش ایک ہاتھ میں سامان

اٹھائے جا رہا ہے۔ لیکن اٹھا نہیں پاتا کبھی ایک ہاتھ میں لیتا ہے کبھی دوسرے میں۔ میں نے سائیکل روک لی۔ سلام کیا۔ سامان اٹھایا اور اسے منزل تک پہنچا دیا۔ بڑی دعائیں دیتا تھا۔" دیکھنے میں یہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن جن کو ان باتوں پر خوشی ہوتی ہے وہی بڑے بڑے کارنامے بھی انجام دیتے ہیں۔

فخر صرف نیک اور بڑے کاموں پر ہی نہیں ہوتا اور بھی بہت سی باتوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً ذات پات پر۔ اپنے وطن، قوم، قبیلے اور خاندان کی شرافت اور عزت پر یا اپنے خاندان کے کسی معزز اور مشہور آدمی پر۔ مثلاً بنو ہاشم اس بات پر یقیناً فخر کر سکتے ہیں کہ ان کے خاندان میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ یا سادات حضور اکرمؐ کی آل ہونے پر۔ یا ہم مسلمان سرورِ کائناتؐ کی امت ہونے پر۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یاد رکھئے یہ جذبہ اسی وقت تک فخر کہلاتا ہے جب تک کہ احساس عزت و مسرت کی حدود میں رہے۔ اس سے آگے بڑھتے ہی یہ بجائے خیر کے شر بن جاتا ہے۔ مثلاً جب کوئی اپنے لباس، مکان، حسب نسب، منصب یا دولت پر اترانے اور شیخی مارنے لگے تو یہ فخر نہیں کہلائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اگر تمہاری کوئی چیز تم سے چلی جائے تو اس پر رنج نہ کرو اور اگر تم کو کوئی اچھی شے میسّر آجائے تو اس پر اتراؤ نہیں اور شیخی نہ مارو۔ اللہ شیخی خوروں اور اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" اب اگر کوئی اترانے اور شیخی مارنے سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھ جائے تو یہی کبر و غرور کہلائے گا جو بہت ہی بڑی بدی ہے۔ شیطان کو اس کے کبر و غرور ہی نے قیامت تک کے لیے لعنت میں گرفتار کرایا ہے۔

فخر، اتراہٹ اور غرور میں یہ فرق ہے کہ فخر میں تو دل میں خوشی اور اللہ کے تشکر کا جذبہ ہوتا ہے۔ اتراہٹ میں اپنی نمود و نمائش منظور ہوتی ہے اور

غرور میں اپنی برتری اور دوسروں کی کمتری اور ذلّت وحقارت کا خیال ہوتا ہے اور یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ غرور، طاقت جسمانی، علم، حسنِ صورت، دولت، منصب حسب نسب، عبادت اور روحانی طاقت وغیرہ پر پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ کم علمی، تنگ نظری اور فقدان غور و تفکر ہوتی ہے۔ مغرور آدمی یہ سمجھتا ہے کہ جو چیز اس کے پاس ہے وہ اور کسی کے پاس نہیں۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو سب سے افضل و برتر اور دوسروں کو حقیر و ذلیل اور کمتر جانتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ جس چیز پر غرور کرتا ہے اُسی کے خیال میں مگن رہتا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ اس چیز کے علاوہ دُنیا میں اور بھی بہت سی نعمتیں اور خوبیاں ہیں جو دوسروں کے پاس ہیں لیکن اُس کے پاس نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ایک پہلوان کو اپنی جسمانی طاقت پر غرور ہے۔ اُس کے ذہن میں کبھی یہ بات نہیں آتی کہ بلا شبہ میرے پاس جسمانی طاقت تو ہے لیکن نہ علم ہے نہ دولت ہے نہ جاہ و منصب۔ پھر میں صرف طاقتِ جسمانی پر کیوں غرور کروں۔ یہی حال دوسروں کا ہے کہ ہر ایک کے پاس ایک دو چیزیں ہیں اُن کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اور بہ فرضِ محال کسی کے پاس اگر سب نعمتیں موجود ہوں تب بھی اس کو یہ غور کرنا چاہیئے کہ یہی نعمتیں اُس سے کہیں زیادہ دوسروں کے پاس موجود ہیں پھر غرور کس بات کا۔ مگر یہ لوگ اس طرح کبھی نہیں سوچتے۔ اگر کچھ دن اس انداز سے غور کریں تو بہت جلد اس بیماری سے نجات مل جائے۔

اب میں خاص طور پر اُن لوگوں کا ذکر کروں گا جن کو اپنی روحانی طاقت پر غرور ہو جاتا ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ روحانی طاقت پر غرور اُن لوگوں کو ہوتا ہے جن کی طلب صادق نہیں ہوتی اور جو بے علم اور کم ظرف ہوتے ہیں اور جو جاہل اور ناقص صوفیوں کی بے سرو پا روایات ہی کو حاصل تصوف

اور کمال سلوک خیال کرتے ہیں اور محض اس مقصد سے بیعت ہوتے ہیں کہ جلدی سے فقیر بن کر لوگوں کو مرید کرنے لگیں اور اُن سے نذرانہ وغیرہ لیکر عیش کریں۔ یہ بات اُن کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتی کہ تصوّف وسلوک کا مقصد و منتہا ذات باری تعالےٰ کا قرب ومشاہدہ اور معرفت ہے اور اس منزل تک پہنچنے کے لیے بڑا وقت اور بے انتہا سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ ان میں کئی آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو بیعت ہوئے اور ذکر وعبادت کرتے ہوئے دو چار ماہ بھی نہیں گذرنے پاتے کہ اُن کا پیمانہ چھلکنے لگتا ہے۔ اب وہ لوگوں کو دکھانے اور ان پر رعب جمانے کے لیے جا وبے جا، موقعہ وبے موقعہ ہر جگہ اپنی عبادت کا ذکر کرتے اور "اللہ ہو" کے نعرے لگاتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ انتہائی طور پر جاہل ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو سمجھانا اور راہِ حق دکھانا بہت مشکل ہے۔ ان کا شیخ تو چونکہ ہر وقت ان کے ساتھ نہیں رہتا اس لیے اصلاح نہیں کر سکتا۔ ہاں البتہ ان کے پیر بھائی جو اُن کے ساتھ رہتے ہیں یہ اُن کا فرض ہے کہ ان کو سمجھائیں اور صحیح راستہ دکھائیں۔ پھر اگر کوئی مان جائے تو سبحان اللہ۔ ورنہ اُن کو ان کے حال پر چھوڑ دینا اور قرآن کی اس آیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے صبر کر لینا چاہیئے کہ "تمہارا کام صرف پہنچانا (صحیح تعلیم دینا) ہے ہدایت کرنا یا گمراہ رکھنا اللہ کا کام ہے"۔

دُوسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جو کہ عبادت وذکر پوری کوشش سے جاری رکھتے ہیں حتیٰ کہ ان میں جذب وحرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وقت بہت نازک ہوتا ہے۔ عالی ظرف اور تعلیم یافتہ لوگ تو اس کو خاطر میں بھی نہیں لاتے لیکن جاہل اور کم ظرف اسی جذب وحرارت کو سلوک کا کمال سمجھ لیتے ہیں۔ اور اگر ان کو کچھ روحانی مناظر یا روحیں نظر آنے لگیں یا کشف وکرامات کی طاقت

پیدا ہو جائے تب تو پوچھنا ہی کیا۔ اب یہ لوگ اپنے آپ کو واقعی کامل و اکمل سمجھ لیتے ہیں۔ عوام پر اپنی بزرگی ثابت کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ عوام تو رہے ایک طرف ان کو تو یہ اپنے سے کمتر بلکہ حقیر و ذلیل سمجھتے ہی ہیں یہ تو سچ مچ کے بزرگوں کو بھی نہیں گانٹھتے اور اُن کے مُنہ آتے ہیں۔ جہاں سنتے ہیں کہ کوئی بزرگ موجود ہے وہیں پہنچ کر اُس پر توجہ کرتے اور جتاتے ہیں کہ ہم بھی بزرگ ہیں۔ اور جس کو اپنے سے کم طاقت ور پاتے ہیں اُس سے روحانی کشتی لڑنے لگتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کا شیخ کامل نہ ہو تو ان کا بہت ہی بُرا حال ہوتا ہے۔ کبھی نہ کبھی ان کا واسطہ کسی ایسے جلالی فقیر سے پڑ جاتا ہے جو ان کی ساری شیخی کرکری کر دیتا ہے اور ان کی ساری پونجی چھین چھان کر دُنیا کی خاک چھاننے کو چھوڑ دیتا ہے۔ بعض تو اس صدمہ سے پاگل ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی اصلاح بھی بہت مشکل ہے۔ اصلاح کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ وہ اپنے شیخ کی بات مانیں اور اُس کے کہنے سے یہ یقین کر لیں کہ اب تک جو کچھ ان کو ملا ہے اُس کی منازل سلوک میں کوئی خاص قدر و قیمت نہیں ہے۔ لیکن ان کو تو کشفِ قبور اور روحانی مناظر دیکھنے کا ایسا چسکا پڑ جاتا ہے کہ وہ اپنے شیخ کی بھی نہیں سنتے۔ بلکہ کئی تو ایسے ہوتے ہیں جو شیخ کو بھی روحانیت میں اپنے سے نیچا سمجھتے ہیں۔ ان کی اصلاح سے بھی مایوس ہو جانا اور ان کا معاملہ خدا پر چھوڑ دینا چاہیئے۔

جو لوگ اس مقام تک بخیر و عافیت سے پہنچ جائیں یعنی ان میں حرارت و جذب بھی کافی پیدا ہو جائے۔ کشف و کرامات کی طاقت بھی آجائے۔ غصہ میں بھی کمی ہو جائے، غرور و نفرت اور دوسرے کبیرہ نقائص بھی جاتے رہیں وہ انشاء اللہ ضرور فائز المرام ہوں گے اور ان کو خدا کا قرب و لقا ضرور میسّر آئے گا۔ ان بزرگوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ناسوت و ملکوت طے کر کے جبروت تک پہنچ گئے ہیں جو ایک

نہایت اعلیٰ مقام اور بڑا مرتبہ ہے۔ لیکن یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جبروتی بزرگوں میں بھی کچھ غصہ ضرور باقی رہ جاتا ہے جس کو لوگ "جلال" کہتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ بزرگ "جلالی" کہلاتے ہیں۔ جبروت سے آگے لاہوت ہے۔ یہاں پہنچنے اور اس کو طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ طبیعت اور اخلاق میں بے انتہا نرمی، شگفتگی اور لطافت پیدا کی جائے اور چھوٹی سے چھوٹی اخلاقی کمی کو بھی دور کر دیا جائے۔ صاحب جلال ہونا کچھ اچھی بات نہیں۔ ہم کو ہر بات میں حضور نبی کریمؐ کی عادات و خصائل اور اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ یاد رہے کہ حضور اکرمؐ سراپا جمال تھے اور اسی وجہ سے اللہ تبارک تعالےٰ نے حضورؐ کو رحمۃ اللعٰلمین کا خطاب عطا فرمایا ہے۔

لاہوت سے آگے ہاہوت اور پھر ہو ہے۔ یہاں صُور و اشکال غائب ہو جاتی ہیں اور صرف وہ بزرگ ہی یہاں تک پہنچ سکتے ہیں جن کا قلبی تعلق دُنیا سے اتنا بھی نہ رہے جتنا ایک رائی کا دانہ۔ اسی کو قطع ماسویٰ اللہ کی تکمیل کہنا چاہیئے اور یہ بات صرف اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں بالکل فنا کر دیا جائے۔ مگر لاکھوں طالبانِ صادق میں سے بھی چند نفوس ہی یہاں تک پہنچ پاتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض اللہ کے فضل و کرم سے ہوتا ہے۔ اس سے آگے لطائفِ اَمر ہیں اور یہ مقامات مخصوص ہیں صرف عارفانِ حق کے لیے۔

حلقہ کے اکثر احباب بجا طور پر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کس مقام پر ہیں۔ تو ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بہت کم آدمی ایسے ہوتے ہیں جن کو خواب یا نیم خوابی کی حالت میں ان مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے یا یہ بشارت دی جاتی ہے کہ تم فلاں مقام طے کر کے فلاں مقام پر آ گئے ہو۔ جن کو نہ بشارت دی جائے نہ کچھ نظر آئے ان کے مقام کا تعین اُن کے اخلاق کی پاکیزگی سے ہوتا ہے۔ ان کو خود غور کرنا چاہیئے کہ بیعت ہونے سے پہلے اُن کا اخلاق کیسا تھا اور اب کیسا ہے۔ ملکوت میں پہنچ کر اخلاق عام

انسانوں کی بہ نسبت بہت اچھا ہو جاتا ہے۔ گناہوں سے دِل محترز رہتا ہے۔ ذکر میں لُطف آتا ہے اور خدا کی یاد اور محبت دِن بدن زیادہ ہوتی جاتی ہے اور دُنیاوی تفکرات و مکروہات کا دِل و دماغ پر اثر کم ہونے لگتا ہے۔ جبروت، لاہوت، ہاہوت اور ہو کا حال پیچھے بیان ہو چکا ہے۔ اگر خود اندازہ نہ ہو سکے یا تسکین نہ ہو تو شیخ سے دریافت کر کے اس کی بات پر یقین کر لینا چاہیئے۔ لیکن سب سے اچھا تو یہ ہے کہ آپ اس چکّر ہی میں نہ پڑیں اپنا کام کرتے رہیں۔ آخر میں خود ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

(۸) آٹھویں رکاوٹ غلط فہمی ہے۔ یہ ایک مبتدی سے لے کر منتہی تک سب ہی کو ہو سکتی ہے۔ مبتدی کی غلط فہمیاں تو اُس کا شیخ رفع کر سکتا ہے مگر منتہی کی غلط فہمی تو خدا کے دُور کیے ہی دُور ہوتی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ غلط فہمی اپنے بس کی بات نہیں اس لیے گناہ نہیں ہے اور اس کی وجہ سے کوئی سالک اپنی منزل سے گِرا نہیں کرتا۔ یہ دُوسری بات ہے کہ آگے ترقی نہ کر سکے۔ غلط فہمی پر مواخذہ بھی نہیں ہو گا۔ مرنے کے بعد اس کو اپنی غلط فہمی معلوم ہو جائے گی اور وہ باقی منازل اُس کی روح طے کرے گی۔ یہ غلط فہمیاں اَن گنت قسم کی ہو سکتی ہیں اِس لیے ان سب کو ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔ تاہم چند مثالیں بیان کی جاتی ہیں عقلمند انسان انہی سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔

مبتدیوں کی غلط فہمیاں تو صرف یہ ہوتی ہیں کہ جب ان میں سوز و حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ کچھ نظر آنے لگتا ہے۔ یا کشف و کرامات کی طاقت آجاتی ہے تو وہ علم نہ ہونے کی وجہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ "ہم کامل ہو گئے" لیکن اس قسم کی غلط فہمیاں شیخ حلقہ یا کوئی اور بزرگ بڑی

آسانی سے دُور کر دیتا ہے۔ مشکل تو ان لوگوں کو پیش آتی ہے جو مقام ھُو یا لطائفِ عالمِ امر سے واسطہ پڑنے پر غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چند بزرگوں کو ابتدا ہی میں جذب و حرارت اور کرامات صادر ہونے کی وجہ سے یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ یہ جذب و حرارت ہی خدا کی ذات ہے جو ہمارے بدن میں حلول کر گئی ہے۔ اور چونکہ کشف و کرامات اسی حالتِ جذب ہی میں زیادہ سرزد ہوتی ہیں اور بہت سے خوارق عادات بھی اسی وقت ان کے صرف کہہ دینے سے ظہور میں آجاتے ہیں۔ اور جب یہ جذب کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو وہ معمولی آدمی رہ جاتے ہیں اور کوئی کرامت نہیں دکھا سکتے۔ اس لیے ان کا یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ یہ خود خدا ہی تھا جو اس وقت ان کے جسم میں حلول کر گیا تھا۔ حالانکہ حلول کا عقیدہ الحاد ہے اور تمام صوفیائے کرام اور علمائے عظام اس بات پر متفق ہیں کہ حلول کا عقیدہ رکھنے والا ملحد ہے۔ لیکن یاد رکھیے کہ حلول کے عقیدہ کو غلط فہمی کی وجہ سے اپنے دِل میں رکھنا تو زیادہ نقصان دہ نہیں اور اس سے رجعت نہیں ہوتی لیکن حالت صحو میں لوگوں کے سامنے اس عقیدے کو بیان کرنا اور اس پر اڑے رہنا بہت بڑا گناہ ہے کیونکہ اسطرح عامۃ المسلین کے عقائد خراب ہوتے اور ان کے ایمان میں خلل آتا ہے۔

یہ تو تھی مبتدیوں کی مثال۔ منتہیوں کی ایک مثال یہ ہے کہ جب وہ ھُو میں پہنچتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہاں کوئی صورت اور شکل موجود نہیں لیکن عالمِ مثال اور عالمِ مادّی میں جو کچھ پیدا ہوتا اور ظہور میں آتا ہے وہ سب اسی مقام ھُو سے وہاں تک مدارج تنزلات طے کرتا ہوا پہنچتا ہے تو وہ لطائف عالمِ امر سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے ھُو کو خدا کی ذات خیال کر لیتے ہیں۔ میرے شیخ جناب مولانا کریم الدین احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ

وہ جب ھُو، عدم، نفس اور عقل کے لطائف طے کر کے لطیفۂ روح میں پہنچے اور یہ لطیفہ ان پر کھلا تو وہ غلطی سے رُوح کو ذاتِ باری تعالےٰ سمجھ بیٹھے اور تقریباً ایک سال تک اسی کو سجدے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر اللہ تعالےٰ نے ان کی دستگیری فرمائی۔ جنگل بیابان میں ایک مجذوب بزرگ ملا۔ اس نے کہا کہ تُو تو کافر ہے۔ رُوح کو سجدے کرتا ہے۔ جب مولاناؒ نے اس سے گفتگو کرنا چاہی تو بجائے گفتگو کرنیکے اس مجذوب نے مولاناؒ کے مُنہ پر ایک زور کا تھپڑ مارا۔ مولاناؒ فرماتے تھے کہ تھپڑ کا لگنا تھا کہ حقیقت مجھ پر روشن ہو گئی اور جس غلط فہمی میں مَیں مبتلا تھا مَیں نے اُس سے توبہ کی اور آگے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ مجھ کو خود دورانِ سلوک ایک ایسی ہی غلط فہمی ہوئی۔ یعنی جب میں عدم میں پہنچا اور مَیں نے معلوم کیا کہ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ کوئی رنگ نہ بو۔ نہ جسم نہ صفت۔ تو میں نے اس کو ذاتِ باری تعالیٰ سمجھا اور تقریباً دو سال اسی غلط فہمی میں مبتلا رہا اور آگے بڑھنے کی کوشش کو ترک کر دیا حالانکہ ابھی سارا عالم امر اور سوادِ عرش طے کرنا تھا۔ لیکن آخر اللہ تعالےٰ نے رحم فرمایا۔ میرے ایک دوست کے ذریعے ایک مجذوب نے مجھ کو پیغام بھیجا کہ "او سینما والے یہ تو دریائے نیل ہے اس پر عوج بن عنق کی ہڈی کا پل ڈال اور دُوسرے کنارے پر چلا جا کہ اصل ملک تو وہیں سے شروع ہوتا ہے"۔ مجذوب کی یہ بڑ سنتے ہی مجھے القا ہوا کہ دریائے نیل سے مُراد عدم ہے اور عوج سے مُراد اوج ہے یعنی تو عدم میں ہے اس کے اوج پر پہنچ جا تو پھر دُوسرے ملک یعنی عالمِ امر میں داخل ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ عقل مند طالب اسی سے سب کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

آیئے اب دُعا کریں کہ اللہ تعالےٰ تمام دُنیا کے مسلمانوں پر رحم کرے اور ان کو ایمانِ کامل دے۔ اللہ تعالےٰ پاکستان کو کفار و مشرکین

کے مقابلہ کی طاقت دے اور اُن پر فتح کامل عطا فرمائے۔ حلقۂ توحیدیہ کے سب بھائیوں کو دین اور دُنیا دونوں میں کامیاب اور سُرخرو کرے اور اپنے پیارے نبی محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صدقہ میں اپنے قرب، لقاء اور معرفت سے سرفراز فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

نوشہرہ ورکاں
۱۶ر اپریل ۱۹۶۶ء

خادم الخدام
عبدالحکیم انصاری

اللہ کے مہر و کرم اور عنایات و نوازشات کا شکر کس مُنہ سے ادا کیا جائے کہ اس نے یہ دِن دکھایا کہ ہم سب پھر ایک جگہ اکٹھے ہوئے تا کہ اپنی خامیوں اور کمزوریوں پر نظر کریں ۔ اور دِل و دماغ کو دنیوی آلائشوں سے پاک صاف کر کے اور اپنے اخلاق و قلوب کا تزکیہ و تصفیہ کر کے پھر ایک ولولۂ تازہ کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس جائیں اور اپنی اصلاح و فلاح کے لیے پُورے جوش و خروش سے کام کر کے ایک حیاتِ نو حاصل کریں ۔ اس لیے آئیے سب سے پہلے اللہ کی گونا گوں مہربانیوں کا شکر ادا کریں اور حمد و ثنا بجا لائیں اور اس کے بعد حضور تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر درود و سلام بھیجیں ۔

اما بعد

اب مَیں اپنی اور پُورے حلقۂ توحیدیہ کی طرف سے میاں محمد علی زاد اللہ عمرہٗ اور ان کے رفقائے کار کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُن کی پُرخلوص دعوت پر ہمارا یہ جلسہ ایک دفعہ پھر لاہور میں ہو رہا ہے ۔ اس موقع پر محمد علی صاحب اور ان کے رفقائے کار نے اپنے مہمان بھائیوں کو آرام پہنچانے

کے لیے جو تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔ اللہ تعالٰے ان کا اجرِ عظیم عطا فرمائے اور دین و دُنیا میں ان سب کو مراتب اعلیٰ عطا فرمائیے۔ آمین!

اس کے ساتھ ہی میں ان تمام پیارے بھائیوں اور مہمانوں کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں جو اطراف و اکناف پاکستان سے تکلیف اُٹھا کر اور کئی ضروری کام ادھورے چھوڑ کر محض اللہ کی خوشنودی کے لیے تشریف لائے ہیں۔

پیارے بھائیو! میں آپ سب کو خلوص دلی کے ساتھ خوش آمدید کہتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ اللہ قادر و توانا آپ کی تمام دِلی تمنائیں برلائے اور خوش و خرم رکھے۔ آمین! یا رب العٰلمین!

برادرانِ حلقہ! خطبہ شروع کرنے سے پہلے نہایت ضروری ہے کہ چند منٹ یا درفتگان کے لیے بھی صرف کیے جائیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال سالانہ جلسہ ختم ہونے کے دو چار دن ہی بعد ہمارے حلقہ کے ایک بہت ہی اچھے اور بزرگ بھائی ہم سب کو داغِ مفارقت دے کر اللہ کے پاس چلے گئے۔ میری مُراد ملک بخشش الٰہی صاحب مرحوم و مغفور سے ہے۔ یہ حلقہ کے سر برآوردہ بھائیوں میں سے تھے۔ ملک صاحب نے حلقہ کی خدمت ۱۸ سال تک نہایت خلوص، تندہی اور جوش و خروش سے کی۔ کراچی کے حلقہ میں ہمارے ارکان کی تعداد دُوسرے حلقوں سے کافی زیادہ ہے اور یہ صرف ملک صاحب کی اَن تھک کوششوں کی وجہ سے ہے۔ صرف تعداد ہی نہیں بلکہ جن لوگوں کی تربیت ملک صاحب نے کی تھی اُنہوں نے رُوحانی اور اخلاقی ترقی بھی خاصی کی ہے۔ ملک صاحب کے علاوہ اور کئی بھائیوں کے والدین اور اعزا و اقربا نے بھی اس سال داعیٔ اجل کو لبیک کہا ہے۔ آیئے ان سب کے لیے خصوصاً حافظ فضل الرحمٰن صاحب کی اہلیہ مرحومہ کے لیے دُعا کریں۔ کہ اللہ تعالٰے ان کو

اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے پس ماندگان کو صبر عطا فرمائے۔ آمین

برادرانِ حلقہ! یہ ہمارا نواں سالانہ اجتماع اور چھٹا خطبہ ہے۔ پچھلے پانچ خطبوں میں مَیں نے وہ تمام امور بہت سادہ اور آسان زبان میں صاف صاف بیان کر دیئے ہیں جو قُرب و معرفتِ باری تعالیٰ کے لیے ضروری ہیں۔ یہ خطبہ لکھنے سے پہلے مَیں نے کئی دن غور کیا کہ اب کیا لکھوں۔ لیکن کوئی نئی یا خاص بات یاد نہ آئی۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس خطبہ میں حلقہ کی تکوین و تدوین کا کچھ حال بیان کروں۔ اور حلقہ کی تکوین سے اب تک طالبانِ راہِ طریقت کے متعلق جو کچھ تجربات ہوئے ہیں اُن پر روشنی ڈالوں۔ اس طرح ہر وہ شخص جو اس خطبہ کو غور سے سُنے گا اور گھر جا کر غور سے پڑھے گا اُس کو اپنی غلطیاں اور خامیاں بہت اچھی طرح معلوم ہو جائیں گی اور وہ چاہے گا تو اُن کو دُور کر کے صراط المستقیم پر گامزن ہو جائے گا اور اپنی مُراد پائے گا۔ جو نہ چاہے گا نامُراد رہے گا۔ لیکن میں اپنے فرضِ رہنمائی و راہبری سے بری الذمہ ہو جاؤں گا۔ وَمَا علینا الا البلاغ۔

محبّانِ عزیز! مَیں نے بیعت کا سلسلہ ۱۹۵۰ء سے شروع اور بخدا بالکل مجبُوری کے عالم میں شروع کیا۔ ورنہ میں "پیر" بن کر منظرِ عام پر آنے کو سخت ناپسند کرتا تھا لیکن ہُوا یہ کہ تقسیم ہند کے بعد قیام کراچی کے دَوران جو لوگ میری صحبت میں رہتے تھے اُن میں سے اکثر حضرات میں وہ رُوحانی آثار پیدا ہو گئے جو ایک سالک میں باقاعدہ بیعت ہونے کے بعد پیدا ہُوا کرتے ہیں۔ جب ان لوگوں میں سوز و جذب

پیدا ہُوا اور سرور و نشہ رہنے لگا تو خواہ مخواہ طلب اور زیادہ ہُوئی۔ اس پر اُنھوں نے اصرار شروع کیا کہ اُن کو باقاعدہ بیعت کر لیا جائے تا کہ وہ منازلِ سلوک طے کر کے اپنی مُراد کو پہنچیں۔ یہ کل پانچ یا سات آدمی تھے لیکن سبھی میرے نہایت عزیز اور بے تکلّف دوست تھے۔ کئی ماہ تک میں انکار اور اُن کے روز افزوں اصرار کا مقابلہ سختی سے کرتا رہا لیکن آخر کار ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔

۱۹۵۴ء تک ارکان حلقہ کی تعداد چالیس پچاس سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن جنوری ۱۹۵۵ء میں جب میں مستقل طور پر بنوں آ گیا تو چند ہی مہینوں میں یہ تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ ۱۹۵۶ء کے آخر میں ضرورت محسوس ہُوئی کہ حلقے کی باقاعدہ تنظیم کی جائے۔ چنانچہ یہ قاعدہ بنایا گیا کہ جس مقام پر کم از کم ۵ آدمی سلسلہ میں شامل ہو جائیں وہیں ایک حلقہ قائم کر دیا جائے اور انہی پانچوں میں سے ایک کو اُن کا انچارج مقرر کر دیا جائے۔ پشاور میں چونکہ ارکانِ حلقہ کی تعداد بہت تھی اس لیے تجربتہً پہلا حلقہ وہیں قائم کیا گیا اور ملک بخشش الٰہی مرحوم کو حلقہ کا انچارج مقرر کر دیا گیا۔ بعد میں دُوسرے شہروں میں بھی اسی طرح حلقے قائم ہوتے چلے گئے۔

تنظیم کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کرتے ہُوئے کئی باتیں منکشف ہُوئیں اور میں نے اُن کو سلسلہ کے دستور میں شامل کر دیا۔ سب سے پہلی بات یہ خیال میں آئی کہ دُوسرے سلسلوں کے مشائخ جو بہت سے خلیفہ بنا دیتے ہیں یہ کچھ اچھی اور مفید بات نہیں ہے۔ اس سے یہ تو ضرور ہوتا ہے کہ مُریدوں کی تعداد بہت جلد بڑھ جاتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ نقصان بھی ہوتا ہے کہ ہر ایک خلیفہ کا مزاج، عادت، علم اور اخلاق

چونکہ دوسرے سے کسی نہ کسی قدر مختلف ہوتا ہے اس لیے اُنکے حلقوں کا رنگ اور طریقہ کار بھی ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتا ہے۔ اس طرح شیخ حلقہ کی جماعت چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور ان ٹکڑیوں میں وہ ارتباط، ہم رنگی و ہم آہنگی باقی نہیں رہتی جو ایک جماعت کی مضبوط تنظیم اور طاقت کے لیے پہلی اور ضروری شرط ہے۔ اس لیے مَیں نے اس طریقے کے بجائے سلسلہ توحیدیہ کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب تک بھی یہ سلسلہ قائم رہے اس کے شیخ کا صرف ایک ہی خلیفہ ہُوا کرے گا اور وہی اس کا جانشین بھی ہوگا۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو ابتدائے اسلام میں یہی طریقہ رائج تھا جو خلفائے راشدین تک قائم رہا۔ اس طریقہ میں ایک دقّت بھی پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ جب اہلِ سلسلہ کی تعداد بہت زیادہ ہو جاتی ہے تو شیخ سلسلہ بنفسہٖ اُن سب کی تربیّت کماحقہٗ نہیں کرسکتا۔ اس لیے مَیں نے یہ طریقہ کار بنایا کہ جہاں کہیں اور جیسے جیسے ضرورت ہو کچھ احباب کو جو قابل اور اہل ہوں مجاز مقرر کر دیا جائے جو اپنے پیر بھائیوں کی تعلیم و تربیت کا فرض ادا کریں۔ چنانچہ اب یہی طریقہ سارے پاکستان کے توحیدی حلقوں میں رائج ہے۔

تنظیم کے لیے دوسری ضروری شرط یہ ہے کہ جماعت کی تمام چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں اور جماعت کے تمام افراد میں باہمی ربط وضبط اور اتنی محبت ہو کہ ایک فرد کو کسی قسم کی تکلیف ہو تو پُوری جماعت کا ہر فرد اُس کو اُسی طرح محسوس کرے جس طرح کہ وہ شخص کر رہا ہے جس پر یہ مصیبت پڑی ہے۔ اس درجہ کا ربط وضبط پیدا کرنے اور اُس کو قائم رکھنے کے لیے مَیں نے یہ طریقے بنائے ہیں۔

۱۔ **ہفتہ وار حلقہ**: ہفتہ وار حلقہ محض اسی لیئے قائم کیا گیا ہے کہ ایک شہر کے سب بھائی ہفتہ میں کم از کم ایک دِن تو آپس میں مل بیٹھیں۔ اپنی کہیں دُوسروں کی سُنیں اور اگر کسی بھائی پر کوئی مصیبت پڑی ہو تو اُس کو سب مِل کر دُور کرنے کی کوشش کریں یا اگر کسی بھائی کو کوئی خوشی کا موقعہ میسّر آیا ہو تو سب مِل کر اُس کی خوشی کو دو بالا کریں۔ ایسے موقعوں پر اگر ساتھ کھانے پینے کا بھی کچھ بندوبست ہو جائے تو سُبحان اللہ۔ میرے خیال میں تو ہر شخص جانتا ہوگا کہ اس قسم کی صُحبتوں اور خصوصاً دعوتوں کی شرکت سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے اور ارتباطِ باہمی کو ترقی ہوتی ہے۔ ایسی مجلسوں کے لیئے تو عام لوگ ناچ رنگ گانے بجانے اور کھیل تماشوں کا اہتمام کرتے ہیں لیکن آپ خود غور کریں کہ جہاں کہیں ایسی صُحبتوں میں اللہ اور اُس کے رسول ؐ کا ذکرِ خیر ہو اور اللہ کے نام پر لوگ اکٹھے ہوں تو اُن مجلسوں کی خیر و برکت کا کیا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مگر افسوس کہ ہمارے حلقے کے بہت سے احباب اس نکتہ پر بالکل غور نہیں کرتے۔ بہت سے تو ایسے ہیں جو ان ہفتہ وار حلقہ ہائے ذکر میں شریک ہی نہیں ہوتے۔ بہت سے ایسے ہیں جو صرف میرے یا دُوسرے پیر بھائیوں کے دکھانے کو محض رسماً شریک ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان سے بھی عجیب تر وہ بھائی ہیں جو اس ہفتہ واری حلقہ ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اور اس میں شریک ہونے کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ بس ہم نے ذکر اللہ کا حق ادا کر دیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ گھر پر روزانہ ذکر نہیں کرتے۔ ہفتہ کے ہفتہ ذکر کر لینے ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو رُوحانیت کا کوئی حصّہ نہیں ملنے گا۔ رُوحانی ترقی تو اُن ہی لوگوں کی ہوتی ہے جو بتائے ہُوئے طریقے

کے مطابق روزانہ ذکر کرتے ہیں اور ہفتہ وار حلقوں میں بھی شریک ہوتے ہیں۔

۲۔ **عام میل ملاقات**: حلقہ کے بھائیوں کو چاہیئے کہ ہفتہ وار حلقہ ذکر کے علاوہ اور دنوں میں بھی جہاں کہیں اور جب کبھی ممکن ہو میل ملاقات کی صحبتیں گرم کیا کریں اور جتنی بھی زیادہ دیر تک ممکن ہو ایک دوسرے کی صحبت میں بیٹھیں۔ چونکہ ان صحبتوں میں لغو اور فضول باتیں نہیں ہوں گی صرف اللہ اور رسولؐ کا ذکر اور دوسری نیک اور مفید باتیں ہوں گی تو اس سے باہمی ربط و ضبط کے علاوہ روحانی طاقت بھی بڑھے گی۔ افسوس ہے کہ حلقہ کے اکثر لوگ اپنے پیر بھائیوں کی صحبت میں بیٹھنے کا کوئی التزام نہیں کرتے۔ یہ لوگ بدنصیب ہیں۔ ان کو پتہ نہیں چلتا کہ وہ کن کن دینوی اور روحانی نعمتوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔

۳۔ **خط و کتابت**: شیخ حلقہ اور اپنے پیر بھائیوں سے خط و کتابت کرنے اور اُن سے اپنے نجی کاموں میں مشورے لینے اور ممکن امداد طلب کرنے سے بھی ربط و ضبط قائم رہتا اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اتنی بات تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ سلسلہ میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمی ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ شیخ سلسلہ ان میں سے ہر ایک کو یاد نہیں رکھ سکتا اور جو آدمی یاد ہی نہ ہو اُس کے لیے دُعا کیسے ہو سکتی ہے اور خاص فیض کس طرح پہنچایا جا سکتا ہے۔ ہمارے حلقہ میں بھی بہت سے آدمی ایسے ہیں جو مُرید ہونے کے بعد سے پھر کبھی ملے ہی نہیں۔ مجھے نہ ان کا نام یاد ہے نہ صورت۔ تنا ئیے میں ان لوگوں کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہوں۔ خدا جانے یہ لوگ حلقہ کی تعلیم پر عمل بھی کرتے ہیں یا نہیں۔

ہاں ایک بات ضرور ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو فوراً خط لکھتے ہیں اور خط میں ایک دو نہیں بلکہ پوری فہرست لکھ دیتے ہیں کہ اس کام کے لیے دُعا کیجیے اور اس کام کے لیے دُعا کیجیے۔ یہ مشکل آسان فرمائیے، یہ عقدہ حل کیجیے اور وہ پریشانی دُور فرمائیے۔ غالباً یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے مُرید ہو کر پیر صاحب پر بڑا احسان کیا ہے۔ اور پیر ہی اس بات کا واحد ذمہ دار بلکہ ٹھیکیدار ہے کہ وہ کچھ کریں۔ نہ کریں پیر اُن کی دُنیا اور دین کے تمام کام خود انجام دے۔ بعض آدمی کہتے ہیں کہ "اچھا تو صرف یہ بتا دیجیے کہ یہ کام ہوگا بھی یا نہیں اور ہوگا تو کب تک ہوگا" گویا پیر قادرِ مطلق ہے کہ اُن کی تقدیر کو بدل سکتا ہے اور عالم الغیب بھی ہے جو بتا سکتا ہے کہ فلاں کام ہوگا بھی یا نہیں۔ اور ہوگا تو کب تک ہوگا۔

یاد رکھئے! اپنے مُرشد سے اس قسم کے سوال کرنا اُس کی انتہائی تذلیل و توہین ہے۔ ایک طرف تو یہ لوگ مُرشد کو قادرِ مطلق مان کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں جس سے بڑا کوئی گناہ نہیں۔ دُوسری طرف اُس کو ارشاد کی گدّی سے اُتار کر فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے نجومی یا پامسٹ کے برابر لا بٹھاتے ہیں۔ "تعمیرِ ملّت" "طریقت توحیدیہ" خطبوں اور ذاتی خطوں میں مَیں نے تو بار بار ہی لکھا ہے اور تقریروں میں ہزاروں بار ہی کہا ہے کہ مجھ میں مطلق یہ طاقت نہیں کہ تمہارے بگڑے کام بنا سکوں۔ تمہاری تقدیر بدل سکوں یا تمہاری مشکلیں آسان کر سکوں۔ مَیں تو خود ایک عاجز انسان ہوں۔ مجھ پر خود ساری عمر مصیبتیں پڑتی رہیں مگر کسی ایک کو بھی دُور نہ کر سکا۔ ہاں یہ مَیں ضرور کر سکتا ہوں کہ تمہارے لیے دُعا کر دُوں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تمہیں خدا اور رسولؐ کے بتائے ہوئے ہدایت کے راستہ کی نشان دہی

کردوں تاکہ اُس راستہ پر کچھ عرصہ ثابت قدمی سے چلنے کے بعد خود تمہارے دلوں میں وہ بات پیدا ہو جائے کہ تمہاری دُعائیں قبول ہونے لگیں اور جو قبول نہ ہوں اُن پر تم کو صبر آجائے۔ افسوس کہ یہ لوگ اس بات کی قدر ہی نہیں جانتے اور میرا کہا بالکل نہیں مانتے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مجھ سے تو بیسیوں ایسی باتوں کی فرمائش کی جاتی ہے جن کا پورا کرنا میرے اختیار میں نہیں صرف خدا کے اختیار میں ہے اور خود اُن دو چار باتوں پر بھی عمل نہیں کرتے جو میں نے اُنہی کے فائدے کیلئے اُن کو بتائی ہیں اور جن کا کرنا اُن کے اختیار میں ہے۔ اللہ ان کو ہدایت دے۔ آمین۔

۴۔ سالانہ اجتماع: یہ اجتماع بھی اسی لیے مقرر کیا گیا ہے کہ جن بھائیوں کو کبھی ملنے کا اتفاق نہ ہوتا ہو وہ یہاں مل کر ایک دُوسرے کے اور نزدیک ہو جائیں اور یہ ملاقات ازدیادِ محبت کا باعث ہو۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ یہاں بھی اکثر بھائی صرف انہی دوستوں سے ملتے اور تین دن تک انہی کی صحبت میں رہتے ہیں جن کو وہ پہلے سے ہی عزیز رکھتے ہیں۔ اس لیے میں سب بھائیوں کو خاص طور پر ہدایت کرتا ہوں کہ یہ خطبہ ختم ہونے کے بعد سے اجتماع کے ختم ہونے تک ہر ایک آدمی نئے نئے بھائیوں سے ملے اور زیادہ وقت انہی کی صحبت میں گزارے۔ اس بات کا تو میں گمان بھی نہیں کر سکتا کہ ہمارے حلقہ میں کوئی آدمی ایسا بھی ہوگا جو اپنے سے غریب یا کم علم بھائی سے ملنے میں عار محسوس کرتا ہو۔ پھر بھی میری ہدایت یہی ہے کہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے بھائیوں سے ملو جو تم سے مرتبہ، علم یا دولت میں کمتر ہیں۔ اس سے تین فائدے ہوں گے ایک تو یہ کہ اگر تمہارے اندر غرور کا کوئی شمہ بھی ہے تو ختم ہو جائے گا۔

دُوسرے یہ کہ غریب بھائی امیروں اور عالموں سے ملنے میں جو جھجک محسوس کرتے ہیں اُن کی اس جھجک اور احساس کمتری کا خاتمہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ ہر ایک کے دِل میں محبت کا چراغ اور زیادہ منور ہو جائے گا جو اس حلقہ کی تعلیم کا ایک خاص مقصد ہے۔

۵۔ ماہوار فنڈ: ویسے تو یہ فنڈ غریب اور ضرورت مند لوگوں کی مدد کے لیے قائم کیا گیا ہے لیکن غور کریں تو اس کی وجہ سے بھی حلقہ کے ساتھ رابطہ اور تعلق قائم رکھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ جو لوگ فنڈ میں حصّہ لیتے ہیں وہ نہ صرف ثواب کماتے ہیں بلکہ ظاہر ہے کہ اُن کو حلقہ کی فلاح و بہبود کا کچھ نہ کچھ خیال ضرور رہتا ہے برخلاف اس کے جو لوگ نہ تو ذکر اذکار کرتے ہیں نہ ہفتہ وار حلقوں میں شریک ہوتے ہیں نہ فنڈ ہی میں حصّہ لیتے ہیں اُن کی بابت کس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ "حلقہ میں شامل ہیں"۔ مَیں تو ان لوگوں کو حلقہ کا رکن نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو بیعت ہونے کے بعد کوئی رُوحانی یا دینوی فائدہ نہیں ہوتا۔

الغرض یہ ہیں وہ طریقے جو مَیں نے حلقہ کے بھائیوں میں ربط ضبط اور تعلق قلبی پیدا کرنے کے لیے بنائے ہیں۔ اگر ان طریقوں کے علاوہ کسی بھائی کے ذہن میں ازدیاد ارتباط و تنظیم کا کوئی اور طریقہ موجود ہو یا آئندہ سمجھ میں آئے تو اُسے چاہیئے کہ مجھ کو بتا دے یا لکھ دے مَیں بہت ممنون ہوں گا۔ اب مَیں حلقہ کی تعلیم کا سرسری ما حال بیان کر کے یہ بتاؤں گا کہ حلقہ کے احباب نے اس پر کہاں تک عمل کیا ہے۔ حلقہ کی تنظیم کے وقت تک مجھے کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں آیا تھا

کہ اس حلقہ کا کوئی نیا نام رکھنا چاہیئے اور تعلیم کو آسان کر دینا چاہیئے۔
مَیں نے خود سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کا سلوک طے کیا تھا اور جو لوگ حلقہ میں شریک ہوتے تھے اُن کو بھی یہی کہتا تھا کہ ہم نقشبندی ہیں مگر جب ہم نے حلقہ کی تنظیم شروع کی تب یہ خیال آیا کہ حلقہ کی تنظیم اور تعلیم موجودہ زمانہ کے حالات و مقتضیات کے مطابق ہونی چاہیئے ورنہ کوئی مفید نتیجہ بر آمد نہ ہو سکے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ پہلے جتنے بھی سلسلے موجود ہیں اُن سب میں اس قدر زیادہ اوراد و وظائف پڑھنے کو بتائے جاتے ہیں کہ اگر انسان اُن کو پوری طرح ادا کرے تو حصولِ معاش کے لیے وقت ہی نہیں بچتا۔ اس کے ساتھ ہی نفس کشی کے لیے اتنے سخت مجاہدے اور ریاضتیں ضروری ہیں کہ اس زمانہ کے نازک مزاج اور نحیف الجثہ لوگ کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ مَیں نے ضروری سمجھا کہ سلوک کو قابلِ عمل بنانے کیلئے اسے مختصر اور آسان کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی خیال آیا کہ پرانے مروجہ سلسلوں میں اپنے پیروں اور فوت شدہ بزرگوں کے مزاروں کی عزت اس قدر مبالغے سے کی جاتی ہے کہ وہ پرستش کی حد تک پہنچ گئی ہے جو قرآن و حدیث کے خلاف ہے۔ باوجود ازیں اگر کوئی سالک روحانیت حاصل بھی کر لے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کی نسبت اپنے شیخ یا کسی فوت شدہ بزرگ سے قائم ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم تک بھی نہیں پہنچ پاتے۔ خدائے بزرگ و توانا کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اور تو اور خود مَیں نے جب سلسلہ نقشبندیہ کا سلوک طے کر لیا یعنی لطائف کھل گئے اور اُن کے دوائر کی سیر کر لی اور مجھے خلافت مل گئی تو مَیں نے اپنے مرشد جناب مولانا کریم الدین احمد رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ قبلہ میں تو اس غرض سے بیعت ہوا تھا کہ مجھ کو خدا کا قرب اور

معرفت یا قسمت میں ہو تو دیدار حاصل ہو جائے وہ تو کچھ بھی نہ ہُوا۔ اور یہ جو کچھ بھی ہُوا ہے وہ تو میرے نزدیک کچھ بھی نہیں۔ تو انہوں نے بھی کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور فرمایا کہ سلسلہ کے سلوک میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ خدا کی طلب ہے تو صبر کرو۔ قسمت میں ہے تو کوئی سامان ہو جائے گا۔

مختصر یہ کہ حلقہ کی تنظیم کرتے وقت یہ سب حالات میرے پیش نظر تھے اور یہ سب باتیں میرے ذہن نشین تھیں کئی ماہ تک دن رات غور و فکر کرتا رہا کہ کیا کرنا چاہیئے مگر کچھ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ یکایک ایک دن بجلی کی طرح ایک خیال دماغ میں آیا کہ سلسلہ کا نام توحیدیہ رکھنا چاہیئے اور تعلیم کی اساس و بنیاد خالص توحید پر ہونی چاہیئے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ القا تھا یا محض خیال مگر طبیعت اس پر جم گئی کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے پہلے "تعمیر ملت" لکھی اور اس میں توحید باری تعالےٰ پر خاصے مدلّل اور مسکت انداز میں بحث کی اور اس کے فوائد ایسی روشن دلیلوں سے ثابت کیے کہ شاید کوئی آنکھوں کا اندھا ہی اُن سے انکار کر سکے۔ اس کے بعد مَیں نے "طریقت توحیدیہ" تحریر کی اور اس میں حلقہ کی تعلیم اور تنظیم صاف صاف قلمبند کر دی اور توحید کے متعلق اپنے عقائد کھول کھول کر بیان کر دیئے لیکن افسوس کہ دُوسرے تو رہے الگ خود میرے اپنے حلقہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو خالص توحید کو نہیں مانتے۔ دُوسروں سے تو مجھے کوئی غرض نہیں کوئی کچھ بھی مانا کرے۔ میرے پاس دُوسروں سے بحث مباحثہ کرنے بلکہ لڑنے جھگڑنے کے لیے فالتو وقت ہی نہیں۔ بقول اکبر الہ آبادی ؎

مذہبی بحث مَیں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

مگر اپنے حلقہ والوں سے تعرّض کیے بغیر تو کسی طرح بھی نہیں رہ سکتا۔ اگر میں اتنا بھی نہ کروں تو حلقہ توحیدیہ قائم کرنے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ آج میری زندگی میں جب میرے حلقہ میں کچھ مشرک گھس آئے ہیں تو میرے مرنے کے بعد کیا ہو گا؟

یہ لوگ اللہ کے سوائے اور بھی چند ہستیوں کو قادر و توانا مانتے ہیں۔ اُن کا قول ہے کہ اولیاء اللہ بھی انسان کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ جس کو چاہیں بنا سکتے ہیں اور جس کو چاہیں بگاڑ سکتے ہیں۔ بس یہی بات شرک ہے۔ اگر وہ یوں مانیں کہ یہ طاقت صرف اللہ ہی کو ہے کہ وہ لوحِ محفوظ پر اپنے لکھے ہُوئے کو مٹا کر اور جو چاہے لکھ سکتا ہے اور وہ اپنے کسی مقبول بندے کی دُعا سے کبھی کبھی ایسا کر بھی دیتا ہے تو یہ لوگ شرک سے بھی بچ جائیں اور اولیاء اللہ کی بزرگی اور عظمت بھی قائم رہے۔ سورۂ رعد میں ارشاد ہوتا ہے "یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتٰبِ ہ یعنی اللہ جو چاہتا ہے لوحِ محفوظ میں سے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے اس میں باقی رکھتا ہے اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے"۔ پس اگر یہ لوگ یوں مانیں کہ اپنے کسی پیارے بندے کی دُعا سے اللہ تعالےٰ لوحِ محفوظ یعنی تقدیر کے لکھے کو مٹا بھی دیتا ہے تو بتایئے اس میں کیا قباحت ہے۔

ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام بشر نہیں خدا تھے (نعوذ باللہ) یعنی اللہ تعالےٰ حضورؐ کی شکل میں خود اس زمین پر نازل ہُوا تھا کہ اپنے گمراہ بندوں کو ہدایت کرے۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ احد اور احمدؐ ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں۔ احد یعنی اللہ میم کا برقعہ اوڑھ کر اور احمدؐ بن کر زمین پر آیا۔ قرآن میں ایک نہیں دو نہیں بیسیوں آیتیں

ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ حضورؐ بشر تھے۔ احادیث میں بھی بیسیوں حدیثیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے بشر ہونے کا بیّن ثبوت ہیں۔ لیکن جب قرآن اور احادیث کے علی الرغم کوئی اپنی ضد پر اڑا رہے تو ایک حق پرست کے پاس سوائے خاموشی کے اور کیا جواب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سورۂ کہف میں ہے۔

"ان سے کہہ دیجئے کہ بے شبہ میں تم ہی جیسا آدمی ہوں البتہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے"۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے "قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا" "کہہ دیجئے کہ سبحان اللہ میں تو آدمی ہوں لیکن رسول ہوں"۔ سورۂ بقرآیت ۱۵۱ میں ہے کہ "ہم نے تم میں ہی سے تمہارے پاس ایک رسول بھیجا۔۔۔۔ الخ۔ سورۂ یونس آیت ۴۹ میں ہے "کہدیجئے کہ میں تو اپنے ذاتی فائدے اور نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتا"۔ سورۂ جن آیت ۲۱ میں ہے "کہدیجئے میرے ہاتھ میں نہیں تمہارا برا بھلا یا راہ پر لانا"۔ سورۂ اعراف آیت ۱۸۸ میں ہے "کہدیجئے کہ میں تو مالک نہیں اپنی جان کے برے بھلے کا بھی"۔ سورۂ انعام آیت ۵۰ میں ہے "کہدیجئے کہ نہ میرے پاس خزانے ہیں نہ میں غیب دان ہوں نہ میں فرشتہ ہوں"۔ سورۂ زمرآیت ۳۰ میں ہے "اے پیغمبر تم بھی مرجاؤ گے اور یہ سب بھی مرجائیں گے"۔

الغرض بے شمار آیتیں ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ بشر ہیں۔ ان تمام آیات کے علاوہ سورۂ اخلاص میں کس قدر صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ لم یلد ولم یولد یعنی "نہ اس نے کسی کو جنا ہے نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے"۔ اب دنیا جانتی ہے کہ حضورؐ تو حضرت بی بی آمنہ کے شکم مبارک سے پیدا ہوئے تھے۔ اس پر بھی اگر کوئی اپنی ضد پر اڑا رہے تو اس کا کیا علاج۔

یہ تو تھا قرآن۔ کتب احادیث میں بھی ایسی بے شمار حدیثیں ہیں۔ مثلاً

بخاری اور ترمذی میں ہے کہ حضورؐ کو بھوک کی شدت اسی طرح محسوس ہوتی تھی جس طرح عام آدمیوں کو محسوس ہوتی ہے۔ بیہقی سے روایت ہے کہ حضورؐ کو بچھو نے کاٹا تو اس پر اسی طرح دم کیا گیا جس طرح عام آدمیوں کو کیا جاتا ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ حضورؐ کو زہر کھلایا گیا تو اس کا اثر ویسے ہی ہوا جیسے کہ عام آدمیوں کو ہوتا ہے۔ بخاری میں ہے کہ حضورؐ پر جادو کیا گیا تو اس کا اثر اسی طرح ہوا جس طرح عام آدمیوں پر ہوتا ہے۔ بخاری ہی میں ہے کہ حضورؐ زخمی ہوئے اور حضورؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے تو حضورؐ کے خون نکلا اور حضورؐ کو اسی طرح تکلیف محسوس ہوئی جیسے کہ عام آدمیوں کو ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ حضورؐ بیمار بھی ہوئے۔ حضورؐ نے کئی نکاح کیے اور آپؐ کے اولاد بھی ہوئی۔ پھر یہ کہ حضورؐ نے عام آدمیوں کی طرح رحلت فرمائی اور دفن کیے گئے۔ کیا یہ سب آیتیں اور حدیثیں انسان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ انہی لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضورؐ کا جسم اطہر مادّہ کا بنا ہوا نہ تھا بلکہ نور کا بنا ہوا تھا۔ مندرجہ بالا آیات اور احادیث اس عقیدے کا بھی بطلان کرتی ہیں مگر جب کوئی ان آیات و احادیث پر غور ہی نہ کرے تو میں اور آپ اُس کا کر ہی کیا سکتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ نہ نور کے اصلی معنے سے واقف ہیں نہ ظلمت کے۔ ظاہر بین آنکھوں کو جو نور اور اندھیرا نظر آتا ہے یہ صرف اتنا ہی جانتے ہیں۔ اگر واقعی یہ لوگ ان الفاظ کے لفظی معنے ہی لیتے ہیں تو بھی غلطی پر ہیں۔ مگر ان کو اپنی غلطی اس لیے نظر نہیں آتی کہ وہ غور و فکر نہیں کرتے۔ اگر وہ ذرا بھی غور کریں تو اُن کو معلوم ہو جائے کہ وہ غلطی پر ہیں۔ دیکھئے یہ لوگ جو حضورؐ اکرم کے مقدس و مطہر جسم کو نور مانتے ہیں تو یقیناً خدا کا

نور ہی مانتے ہوں گے۔ ایسا نور تو ہرگز نہ مانتے ہوں گے جیسا کہ جلتی ہوئی دیا سلائی کا نور یا موم بتی کا، چراغ یا بجلی کے بلب کا، یا اس سے بھی بڑھ کر ستاروں، چاند اور سورج کا نور۔ اب اگر یہ غور کریں تو ان کو معلوم ہو کہ ہر بڑے اور تیز نور کے سامنے اُس سے چھوٹا اور کمتر نور مدھم یا بالکل غائب ہو جاتا ہے۔ مثلاً جس کمرے میں مٹی کے تیل کا چراغ یا ۱۵ کی پاور کا بلب جل رہا ہو وہاں اگر ہزار کینڈل پاور کا بلب روشن کر دیا جائے تو مٹی کے تیل والے چراغ اور ۱۵ نمبر کے بلب کی روشنی بالکل ہی غائب ہو جائے گی حالانکہ وہ وہیں موجود ہو گی۔ اب اس ناقابل تردید ثبوت کی روشنی میں غور کیجئے کہ اگر حضورؐ کا جسم خدا کا نور تھا تو اُس نور کے سامنے دن کے وقت سورج کی اور رات کے وقت چاند کی روشنی ماند کیوں نہیں پڑ جاتی تھی اور مزید برآں یہ کہ خود حضورؐ کو رات کے وقت چراغ روشن کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی تھی۔ سورج اور چاند تو خدا کی بہت ہی ادنیٰ مخلوق ہیں پھر اس مادّی مخلوق کا نور خود خدا کے نور کی موجودگی میں ماند نہ پڑے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

میں خود نبی کریمؐ کو نور سمجھتا ہوں لیکن اُن معنوں میں نہیں جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا۔ میرا اور ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے اور یہ امر واقعہ بھی ہے کہ حضورؐ کی بعثت سے پہلے یہ دُنیا کفر و گمراہی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گھری ہوئی تھی۔ خدائی تعلیم جو پچھلے پیغمبروں کے ذریعہ نازل کی گئی تھی مسخ یا غائب ہو چکی تھی، انسان انسان کو کھا رہا تھا۔ ہر زبردست، کمزوروں پر ظلم اور سختیاں کرنا اپنا حق سمجھتا تھا۔ برائی بھلائی میں کوئی تمیز نہ تھی۔ شراب، جوا، چوری، قتل، زنا، دختر کشی تفریحات کا سامان تھیں۔ دجل فریب،

مکر و ریا اور جور و جفا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ غریب انسان، بادشاہوں، امیروں اور حاکموں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کسی جائے پناہ کے لیے، مارے مارے سرگرداں و پریشاں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے تھے لیکن کوئی ہادی و ملجا دکھائی نہ دیتا تھا۔ کہیں سر چھپانے کی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ یہ حال تھا کہ ایک سرزمین غیر ذی زرع کے مرکز یعنی مکّہ مکرّمہ کے ایک مبارک گھر سے آفتاب ہدایت کا نور چمکا۔ مخالف عناصر نے بہت مقابلہ کیا۔ بہت زور مارا کفر و شرک کی گھنگھور گھٹائیں اُٹھیں اور ظلم و ستم کی آندھیاں چلیں کہ اس نورِ ضیا بار کی روشنی کو آگے نہ پھیلنے دیں۔ لیکن سب مٹ گئیں، دب گئیں اور فنا ہو کے رہ گئیں۔ رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ تمام مشرق وسطیٰ اس نورِ لازوال کی ضو پاشیوں سے چمکنے دمکنے لگا۔ جگمگا اُٹھا۔ امن و امان، عدل و انصاف اور اخوّت و مساوات کی صبح روشن طلوع ہوئی۔ امیروں اور ظلم و ستم کے علمبرداروں کی گردنیں جھک گئیں یا توڑ دی گئیں۔ غریبوں کو جائے پناہ اور ماویٰ و ملجا میسّر آیا۔ دُنیا نے اطمینان کا سانس لیا اور سب اپنے اپنے کام میں لگ کر تہذیب و ترقی کے راستے پر گامزن ہو گئے۔

اس نورِ جہاں تاب سے صرف ممالک مشرق وسطیٰ ہی منور نہ ہوئے بلکہ باقی دُنیا کا بھی کوئی ملک ایسا نہ رہا جہاں اس کی روشنی نہ پہنچی ہو اور جو اسلام کی تعلیم و تہذیب اور مسلمانوں کے اخلاق اعلیٰ سے متاثر و متمتع نہ ہوا ہو۔ دُنیا جانتی ہے کہ اس وقت یونان کے بوسیدہ فلسفے اور روما کے ظالمانہ قوانین جہاں بانی کے سوا یورپ کے کسی ملک میں بھی حق و انصاف، عدل و مساوات، امن و امان اور علم و اخلاق کا نام و نشان نہ تھا۔ یہ سب باتیں اُنھوں نے مسلمانوں ہی سے سیکھیں۔ آج بھی ان ممالک کے قصرِ ترقی کی

بنیادیں کھود کر دیکھی جائیں تو آپ کو وہاں اسلامی تعلیم و تہذیب اور اسلامی اخلاق کے جواہر ریزے ہی چمکتے دمکتے نظر آئیں گے۔

آپ نے کبھی سوچا ہے کہ نور و ظلمت یا اُجالے اور اندھیرے کی خاصیت کیا ہے؟ نہیں سوچا تو اب سوچئے۔ آپ میں سے اکثر حضرات کو اکثر یہ اتفاق ہوتا ہوگا کہ رات کے وقت اپنے مکان یا کمرے میں داخل ہوں تو وہاں گھپ اندھیرا ہوتا ہے اور آپ کو مطلق نہیں دکھائی دیتا کہ کونسی چیز کہاں رکھی ہے۔ کونسی چیز بے ضرر اور کس چیز سے ٹھوکر لگنے کا اندیشہ ہے۔ مگر جُونہی آپ بلب کا سوئچ دباتے ہیں کمرے میں نور پھیل جاتا ہے اور آپ کو سب چیزیں صاف صاف نظر آنے لگتی ہیں اور آپ اُن چیزوں سے بچ کر نکل جاتے ہیں جن سے ٹھوکر لگ سکتی تھی۔ اب ایک ایسی رات کا تصوّر کیجئے جو سخت اندھیری ہے اور آپ جنگل بیابان میں چلے جا رہے ہیں۔ چاند کی آخری تاریخیں ہیں۔ آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ کوئی ستارہ بھی نظر نہیں آتا۔ راستہ سخت ناہموار اور دشوار گزار ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آتا۔ دو قدم آگے کی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ کچھ نظر نہیں آتا کہ آگے کھائی ہے یا کھڈ یا کوئی ٹیلا۔ خاردار جھاڑیاں ہیں یا نوکیلے پتھر، سامنے دس قدم پر کوئی اژدہا پڑا ہے یا کوئی خونخوار درندہ چھپا ہوا گھات لگائے بیٹھا ہے۔ سوچئے اور خوب سوچئے کہ اس وقت آپ کا کیا حال ہوگا۔ آپ کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی اور اس سیاہ رات کے طویل گھنٹوں میں کتنا سفر کر سکیں گے۔ اب غور کیجئے کہ کافی عرصہ تک یونہی ٹھوکریں کھاتے اور گرتے پڑتے چلتے رہنے کے بعد مطلعِ مشرق پر آثارِ سحر نمودار ہوئے۔ سپیدۂ صبح نے شاہِ خاور کے برآمد ہونے کی خوشخبری سنائی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُجالا ہو گیا۔ اب آپ کو نہ صرف اپنے گرد و پیش بلکہ حدِ اُفق تک ہر چیز

صاف نظر آنے لگی۔ آپ کو دکھائی دینے لگا کہ کون سی چیز مضرت رساں ہے، کونسی بے ضرر اور کونسی مفید۔ اب آپ مفید چیزوں سے فائدہ اُٹھانے، بے ضرر چیزوں کو مناسب طریقے سے استعمال کرتے اور مضرت رساں چیزوں سے دامن بچاتے پُوری تیز رفتاری سے چلنے لگے اور بامُراد و شادکام منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ یہی حال کفر و اسلام کا ہے۔ کفر ظلمت و اندھیرا ہے اور اسلام روشنی و نور۔ کافر مطلق نہیں جانتا کہ اس کائنات کا اور خود اُس کا اپنا کوئی خالق ہے جو اس کے مرنے کے بعد اُس سے نیکی و بداعمالی کی پُرسش کرے گا اور اُن پر جزا و سزا دے گا۔ کافر کو قطعاً نہیں معلوم کہ بُرائیوں سے اُس کی رُوح کمزور، بیمار اور مفلوج ہو جاتی ہے اور مرنے کے بعد سخت تکلیف اُٹھاتی ہے لیکن اسلام کا نور قلب میں داخل ہوتے ہی خیر و شر اور خوب و زشت ہر انسان کو ایسے صاف صاف نظر آنے لگتے ہیں جیسے دوپہر کا چمکتا ہُوا سُورج۔ سوچو کہ یہ کتنی وقیع بات ہے جس کے معلوم ہو جانے سے ایک آدمی کی دُنیوی زندگی بھی سُدھر جاتی ہے اور آخرت میں بھی وہ کامیاب رہتا ہے۔ اب غور کرو کہ اس نورِ اسلام کا منبع اور مخزن کون ہے اور کہاں ہے۔ یہ ہی ہمارے نبیؐ مکرم کی ذات پُرانوار ہے۔ اسی ذات سے یہ نور اس دُنیا میں پھیلا ہے اور قیامت تک باقی رہے گا۔ غالباً اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا کہ ہمارے حضورؐ کن معنوں میں نور ہیں اور حقیقتاً نور ہیں۔ لیکن یہ خیال کہ حضورؐ بشر نہ تھے اور حضورؐ کا جسم مبارک مادی نہیں بلکہ خالص نور تھا تو یہ خیال چونکہ قرآن، احادیث اور امر واقعہ کے خلاف ہے اس لیے محض طفلانہ ہے۔ پڑھے لکھے آدمی ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔

اب میرا رُوئے سخن حلقہ کے ان احباب کی طرف ہے جن کا ذکر اُوپر کیا گیا

اور جن کو سمجھانے کے لیے یہ سب کچھ لکھنا پڑا۔ آپ لوگوں کے لیے صرف دو ہی راستے ہیں۔ یا تو آپ اپنے ان مشرکانہ عقائد سے بصدقِ دل توبہ کریں یا ہمارا حلقہ چھوڑ کر کسی ایسے حلقے میں شامل ہو جائیں اور ایسے شیخ سے بیعت کر لیں جو آپ کا ہم عقیدہ ہو۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا، زبان سے کچھ کہتے رہے اور دل میں وہی عقیدہ رکھا تو جان لیجیے کہ آپ اوّل درجے کے منافق ہیں جو کافروں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ کافرین کم از کم یہ خوبی تو ہے کہ اپنے عقیدۂ کفر کا صاف صاف اقرار کرتا ہے چھپاتا نہیں۔ یاد رکھئے منافق کا انجام بہت ہی دردناک اور عبرت انگیز ہوا کرتا ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

برادرانِ حلقہ! یہ تو تھیں ہمارے حلقے کے بنیادی عقیدے کی باتیں اب دوسری باتوں پر بھی کچھ روشنی ڈالنا اور تبصرہ کرنا ضروری ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے تحریر و تقریر میں یہ بات ہزاروں بار کہی ہے کہ مجھے حلقہ کی تعداد بڑھانا ہرگز منظور و پسند نہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ حلقہ میں کم سے کم آدمی ہوں لیکن وہ سب کے سب عقیدے کے لحاظ سے پکے "مسلمان اور توحیدی ہوں... اور اعمال و اخلاق کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے مومن۔ لیکن افسوس ہے کہ بار بار کی تاکید و تنبیہ کے باوجود ہمارے کئی خادمانِ حلقہ" نے محض تعداد بڑھانے کے لیے بہت سے جاہل اور نااہل لوگوں کو حلقہ میں شامل کر لیا ہے اور یہی لوگ تکلیف و فساد کا باعث ہوتے ہیں۔ دراصل ان لوگوں کو خدا کی طلب تو ہوتی نہیں محض رسماً مرید ہو جاتے ہیں۔ یا پھر اس خیال سے حلقہ میں شامل ہوتے ہیں کہ دنیا سدھر جائے گی۔ ایسے نااہل لوگوں کی در آمد کو روکنے کے لیے ہی میں نے یہ طریقہ مقرر کیا ہے کہ جو کوئی حلقہ میں شامل ہونا چاہے پہلے اس کو طالب بنا کر حلقہ کی تعلیم سکھا دی جائے اور برس دو برس دیکھا جائے کہ وہ کچھ کرتا ہے یا نہیں۔

اگر وہ پکّا ثابت ہو، اس میں کچھ آثار رُوحانیت پیدا ہو جائیں اور اس کے اخلاق کی اصلاح ہو جائے تب اُس کو بیعت کر لیا جائے ورنہ نہ کیا جائے۔ اس قاعدے پر سختی سے عمل نہیں کیا گیا۔ اس لیے بہت سے آدمی حلقہ میں ایسے گھس آئے جو اب درد سر بنے ہوئے ہیں۔ تاہم میں خدا تعالےٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ہمارے حلقہ میں اب بھی اسّی فیصد آدمی اخلاق کے لحاظ سے اور پچیس فیصد آدمی اخلاق و رُوحانیت دونوں لحاظ سے نہایت اچھے اور پکّے ہیں۔ مگر میری دلی خواہش یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد جو رُوحانی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے بلند مرتبہ ہوں سو فیصد ہونی چاہیئے۔ اس لیے میں اپنے حلقہ کے خادموں اور مجازین کو ہدایت کرتا ہُوں کہ وہ لوگوں کو حلقہ میں شامل کرتے وقت بہت ہی احتیاط سے کام لیں۔ جلدی بیعت نہ کرائیں اور اس وقت تک طالب ہی رہنے دیں جب تک کہ وہ ہمارے معیار پر پُورے نہ ہو جائیں۔

عبادت و اذکار: مَیں نے جہاں تک غور کیا ہے حلقہ کے ستّر اسّی فیصد آدمی نماز روزے کے خوب پابند ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو تہجّد بھی پڑھتے ہیں اور نفی اثبات کا ذکر علی الصبح کرتے ہیں۔ لیکن بیس تیس فیصد ایسے بھی ہیں جو نماز باقاعدہ نہیں پڑھتے۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو کئی کئی ہفتہ نماز نہیں پڑھتے۔ اوّل الذکر کا کیا کہنا اُن پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو نماز کا اور زیادہ شوق عطا فرمائے اور ان کی نمازوں کو اپنے تقرب کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔ لیکن افسوس ہے ان کی حالت پر جو نماز باقاعدہ نہیں پڑھتے یا عرصہ دراز تک ناغہ کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو طریقت توحیدیہ غور سے پڑھنا چاہیئے اور سوچنا چاہیئے کہ نماز باقاعدہ پڑھنے سے ہی انسان پکّا مسلمان بنتا ہے۔ اور جو پکّا مسلمان ہی نہ ہو وہ لاکھ ذکر کرے مومن کس طرح بن سکتا

ہے اور درجۂ احسان پر کس طرح فائز ہو سکتا ہے۔ نماز نہ پڑھنے والوں میں سے اکثر آدمیوں کے جو خطوط میرے پاس آتے ہیں۔ ان میں وہ لکھتے ہیں کہ "مجھ کو نماز پڑھنے میں سخت سستی اور کاہلی محسوس ہوتی ہے اس واسطے ناغہ ہو جاتی ہے"۔ یا یہ کہ "ڈیوٹی کی وجہ سے نماز نہیں ہو سکتی"۔ یا یہ کہ "نماز میں دِل نہیں لگتا"۔ اور ایسی باتیں لکھنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "آپ دُعا کریں کہ میں نماز باقاعدہ پڑھا کروں"۔ مَیں ان لوگوں کو ہمیشہ یہ جواب دیتا ہُوں کہ نماز کے لیے سستی اور کاہلی وغیرہ کا عذر بالکل مسموع نہیں ہو سکتا۔ نماز ایک اختیاری شے ہے۔ اختیاری شے کے لیے دُعا نہیں کی جاتی۔ آپ سستی کاہلی وغیرہ کے باوجود نماز پڑھیں۔ رفتہ رفتہ عادت ہو جائے گی۔ آپ باقاعدہ نماز پڑھنے لگیں گے اور دِل بھی لگنے لگے گا۔ مَیں ان حضرات سے پھر کہتا ہُوں کہ براہِ مہربانی مجھ کو ایسی اختیاری باتوں کے لیے دُعا کے واسطے نہ لکھا کریں۔ خود کوشش کریں۔ دُعا البتہ میں کر بھی دیتا ہُوں لیکن جس چیز کی آپ کو دِل سے رغبت اور خواہش ہی نہ ہو اس چیز کے لیے دُوسروں کی دُعا کیسے قبول ہو سکتی ہے۔ دُعا تو ان چیزوں کے لیے قبول ہوتی ہے جن کی آپ کو دِل سے خواہش ہو اور وہ باوجود کوشش بسیار میسّر نہ آئیں۔ روزے کے متعلق جہاں تک مجھے علم ہے تقریباً سبھی رکھتے ہیں سوائے ان چند آدمیوں کے جو شرعاً معذور ہُوں۔ زکوٰۃ اور حج کا مجھے علم نہیں کہ ہمارے حلقہ میں کن کن لوگوں پر فرض ہے۔ صرف تین چار آدمی ہیں جو ہر سال زکوٰۃ کا کچھ حصّہ حلقہ فنڈ میں دیتے ہیں۔ حج کی بابت مجھے مطلق علم نہیں کہ کس کس پر فرض ہے۔ بہرحال جن لوگوں پر یہ دونوں چیزیں فرض ہوں اُن کو ضرور یہ فرض ادا کرنا چاہیئے۔ اس سے خدا اُن کے مال و دولت میں بہت برکت دے گا اور آخرت میں سرخرو فرمائے گا۔ جو لوگ یہ فرض ادا نہ کریں گے

مرنے کے بعد اللہ ان سے پوچھے گا اور وہ سخت مصیبت میں پھنس جائیں گے۔
اب رہے اذکار۔ یعنی پاس انفاس اور نفی اثبات کا ذکر۔ تو وہ اسقدر آسان ہیں کہ اُن کے لیے مطلق وقت درکار ہی نہیں ہوتا۔ پاس انفاس تو آپ دن اور رات میں جس وقت بھی خالی ہوں اسی وقت کر سکتے ہیں، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے۔ بتائیے یہ کون سا مشکل کام ہے۔ اب اس سے زیادہ آسان ترکیب تو میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ رہا نفی اثبات تو میں نے بتایا ہے کہ وہ دس یا زیادہ سے زیادہ بیس منٹ کرنا کافی ہے۔ اگر آپ خدا کا قُرب حاصل کرنے کے لیے پندرہ بیس منٹ بھی خرچ نہیں کر سکتے تو پھر یقین کر لیجئے کہ آپ کا سلوک کبھی کامیابی سے طے نہیں ہو سکتا اور آپ کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ عجیب بات ہے کہ اگر آپ کو لاہور سے پشاور یا کراچی جانا ہو تو اس کے لیے کتنا اہتمام کرتے ہیں ٹیکسی منگاتے ہیں اس پر سٹیشن جاتے ہیں وہاں ٹکٹ خریدتے ہیں پھر گھنٹوں ریل میں بیٹھے رہتے ہیں تب منزلِ مقصود پر پہنچتے ہیں۔ مگر خدا تک پہنچنے کے لیے دس پندرہ منٹ بھی خرچ نہیں کر سکتے۔ شرم آنی چاہیئے۔

بات دراصل یہ ہے کہ سُستی و کاہلی اور دل نہ لگنا تو بہانے ہیں ان لوگوں کو خدا کی طلب ہی نہیں ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو محض رسماً حلقہ کے خدام کی بے پرواہی سے حلقہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جن کو طلب تو ہو لیکن قوتِ ارادی اس قدر کمزور ہو کہ سُستی و کاہلی پر غالب نہ آ سکے۔ ان لوگوں کو قوتِ ارادی کے طاقتور بنانے کی ایک ترکیب بتا سکتا ہوں۔ اگر وہ کوشش کریں گے تو کامیابی یقینی ہے۔ ترکیب یہ ہے کہ آپ کسی چھوٹی اور معمولی سی بات کو جس کا کرنا آپ کے لیے

بہت ہی آسان ہو اپنے اُوپر لازم کر لیں اور وقتِ مقررہ پر اُس کو ضرور کر لیا کریں۔ جب اُس کی عادت ہو جائے تو اُس سے کچھ مشکل سی بات کو اسی طرح اپنے اُوپر لازم کر کے انجام دیتے رہیں اور یونہی رفتہ رفتہ آسان باتوں سے مشکل باتوں کی طرف بڑھتے اور کرتے رہیں۔ اس طرح ایک دِن وہ آئے گا جب مشکل سے مشکل بات بھی آپ کو بالکل آسان معلوم ہوگی اور اس کو سرانجام دینے میں آپ کو ذرا بھی تکلف یا دِقّت نہ ہو گی۔ اس بات کو زیادہ واضح اور قابل فہم بنانے کے لیے دو ایک مثالیں بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح آپ اس ترکیب کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے :۔

مثلاً آپ یہ بات اپنے اُوپر لازم کر لیں کہ جب سونے لگیں تو کسی معمولی سی چیز مثلاً کُرسی کو اُس کی جگہ سے اُٹھا کر کسی خاص جگہ رکھ دیں تب سوئیں۔ اب آپ روزانہ کُرسی کو اُٹھا کر اُسی خاص جگہ پر رکھ دیا کریں یہاں تک کہ آپ کو اس کی عادت ہو جائے یعنی بغیر ارادہ کیے عادتاً ایسا کرنے لگیں۔ اس کے بعد آپ اس کام کو چھوڑ کر کوئی ذرا مشکل کام اپنے اوپر لازم کر لیں۔ مثلاً یہ کہ جب تک آپ اپنے کمرے یا صحن میں پورے سو قدم گن کر ٹہل نہ لیں۔ اس وقت تک ہرگز نہ سوئیں۔ جب یہ بھی ہو جائے تو گھڑی دیکھ کر پُورے دس یا پندرہ منٹ ٹہلنا یا کچھ پڑھنا لازم کر لیں۔ یہ بھی ہو جائے تو پھر یہ لازم کر لیں کہ روزانہ وضو کر کے سویا کریں۔ یہ بھی ہو جائے تو وضو کے بعد دو نفل پڑھنا بھی لازم کر لیں۔ اس کے بعد دُنیا کے کاموں میں سے کوئی مشکل سا کام منتخب کریں اور دو چار سال یونہی کرتے رہیں۔ آخر میں آپ دیکھیں گے کہ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں سے آپ کی قوتِ ارادی اتنی طاقتور ہو جائے گی کہ دُنیا کا کوئی کام آپ کے لیے مشکل نہ رہے گا۔ مگر شرط یہی ہے کہ آپ دِل سے یہ سب کچھ کرنا چاہتے ہوں اپنے آپ

کو دھوکا نہ دے رہے ہوں۔

ذکر اذکار وغیرہ کا بیان کافی ہو چکا۔ اب مجاہدہ کے متعلق بھی کچھ کہنا ضروری ہے۔ تو مجاہدے کی بابت میں نے آپ کو صرف یہ بتایا ہے کہ دو چیزیں چھوڑ دیجئے اور دو اختیار کر لیجئے۔ یعنی غصّہ اور نفرت چھوڑ دیجئے اور اُن کی جگہ عالمگیر محبت اور صداقت یعنی حق کو اختیار کر لیجئے۔ ان کا مفصّل بیان تو آپ نے "تعمیرِ ملّت" اور "طریقت توحیدیہ" میں پڑھ ہی لیا ہو گا۔ یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ ہمارے اہلِ حلقہ نے ان باتوں پر کہاں تک عمل کیا ہے۔ چنانچہ میں یہ بات کسی قدر وثوق بلکہ فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ اس بارے میں اہلِ حلقہ کی اکثریت نے کمال کر دکھایا ہے۔ یعنی حلقہ کے بیس پچیس فیصد آدمی ایسے ہیں جنہوں نے غصّہ کو بالکل نفی کر دیا ہے یعنی غصّہ پر قابو پا لیا ہے۔ (دیکھئے تعمیرِ ملّت) ساٹھ ستر فیصد آدمی ایسے ہیں جن کا غصّہ بہت ہی کم ہو گیا ہے صرف دس بارہ فیصد آدمی ایسے ہیں جن کا غصّہ بالکل کم نہیں ہُوا۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جو حلقے کی تعلیم پر مطلق عمل نہیں کرتے۔ ان لوگوں سے تو کچھ کہنا فضول ہے۔ لیکن جن کا غصّہ کم ہو چکا ہے اور وہ واقعی اس کو نفی کرنا چاہتے ہیں اُن کو بتانا چاہتا ہوں کہ غصّہ نفی کرنے کی مشق اُن کے اپنے گھر میں ہی اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غصّہ عام طور پر اپنے سے کمزور اور اپنے دستِ نگر لوگوں ہی پر آتا ہے۔ اپنے سے بڑے اور طاقتور لوگوں پر تو غصّہ صرف انہی کو آ سکتا ہے جو بالکل ہی پاگل ہوں۔ تو آپ کو بھی غصّہ اپنی بیویوں اور بچوں پر ہی آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ جتنی مرتبہ آپ کو غصّہ آئے اتنی ہی مرتبہ آپ کو غصّہ کم کرنے کی مشق کرنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ اس لیے آپ یہ مشق گھر ہی سے شروع کریں اور اپنی بیویوں اور بچوں پر غصّہ نہ کیا

کریں۔ اگر آپ ان کی اصلاح کے لیے اُن پر غصّہ کرنا بجا سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی خام خیالی ہے۔ اصلاح تو صرف پیار و محبت اور مصلحت و حکمت سے ہی ہو سکتی ہے۔ سختی اور غصّہ سے تو کام اور بگڑ جاتا ہے۔ دیکھئے مسلمان کے گھر کو نبی کریمؐ نے حرم فرمایا ہے۔ حرم میں کیا ہوتا ہے؟ نہ کوئی کسی کو قتل کر سکتا ہے خواہ وہ واجب القتل ہی کیوں نہ ہو۔ نہ کسی سے لڑ جھگڑ سکتا ہے۔ نہ مار پیٹ کر سکتا ہے نہ سخت آواز ہی سے بول سکتا ہے۔ تو حرم کہنے سے حضورؐ اکرم کا مطلب یہی ہے کہ ایک مسلمان کے گھر میں کامل سکون، اطمینان، مسرت، خوشی اور امن و امان ہونا چاہیئے۔ ایسے گھر جنّت کا نمونہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ جنّت کے لیے بھی اللہ تعالےٰ یہی فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ جنت میں ہوں گے وہ وہاں کسی طرح کی بکواس نہیں سُنیں گے" (سورہ الغاشیہ) سورہ واقعہ میں ہے کہ "وہاں نہ کوئی بیہودہ بات سُنیں گے نہ گالی گلوچ" سورۂ نسا میں ہے کہ "وہ وہاں نہ کوئی بے ہودہ بات سُنیں گے۔ نہ جھوٹ اور خرافات"۔ غور کیجئے کہ جہاں بکواس تک بھی نہیں ہوگی وہاں لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ کا بھلا کیا کام۔ ویسے بھی غور کیجیے کہ جس گھر میں مار پیٹ اور لڑائی جھگڑا رہتا ہو وہاں بچّے کیسے اٹھیں گے۔ وہ ڈرے سہمے، چڑچڑے، بد اخلاق، کم حوصلہ یا ایک جملہ میں یوں کہیے کہ شرافت سے بالکل عاری ہوں گے اور بڑے ہو کر بھی ذلیل و حقیر ہی رہیں گے اور اس کی ذمّہ داری ماں باپ پر ہو گی۔ بلکہ باپ پر زیادہ ہو گی کیونکہ باپ عام طور پر تعلیم یافتہ، جہاندیدہ اور تجربہ کار ہوتے ہیں۔ وہ چاہیں تو بیویوں کی سو فیصدی اصلاح کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ چاہیں کہ مار پیٹ اور لڑائی جھگڑے سے اصلاح کر لیں تو یہ ناممکن ہے۔ مفصّل بیان کے لیے تعمیرِ ملّت دیکھئے۔

کچھ لوگ حلقہ میں ایسے بھی ہیں جو غصّہ کے علاوہ بیویوں سے نفرت بھی کرتے ہیں یا ان کو پسند نہیں کرتے ۔ یہ بہت ہی نا سمجھ لوگ ہیں ۔ نفرت اگر صورت شکل سے ہے تو یہ بات شادی سے پہلے دیکھنے کی تھی ۔ شادی کے بعد اور خصوصاً کئی سال بعد نفرت کا پیدا ہو جانا عجیب سی بات ہے ۔ میرے خیال میں تو یہ بات خود مردوں کے چلن کی خرابی اور اوباشی کے باعث پیدا ہوتی ہے ۔ نفرت اگر عورت کی عادتوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے تو اس کی بابت میں ابھی بتا چکا ہوں کہ عادتوں کی اصلاح کی زیادہ ذمّہ داری مرد پر ہی عائد ہوتی ہے ۔ صبر، محبت اور حکمت و مصلحت سے کام لیا جائے تو عورت کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا کچھ بھی دشوار نہیں ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث ہے کہ عورت آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے ۔ اس لیے اُس کی خلقت ہڈی کی طرح ٹیڑھی ہے ۔ اس کو زیادہ نہ دباؤ ورنہ ٹوٹ جائے گی ۔ دیکھیے یہ کتنا حکمت آموز کلام ہے ۔ اب اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا آپ کا کام ہے ۔ بہر حال اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا گھر جنّت کا نمونہ ہو تو اس کے لیے آپ کو خوب محنت کرنی پڑے گی ۔ صرف سوچتے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا ۔ آپ کو صبر کرنا ہوگا ۔ خود اپنی بُری عادتیں بدلنی پڑیں گی، غصّہ کو نفی کرنا ہوگا ۔ اور یہ جو کچھ بھی آپ کریں گے اس سے خود آپ ہی کو فائدہ ہوگا ۔ دماغ و دِل کو راحت ملے گی ۔ اطمینانِ قلب حاصل ہوگا جس کی وجہ سے آپ کے دنیوی کام آسان ہو جائیں گے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اللہ تبارک تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی ۔

غصّہ اور نفرت کے متعلق جو کچھ لکھا گیا میرے خیال میں ایک

طالب صادق کے لیے کافی زیادہ ہے۔ لیکن جو لوگ اپنی اصلاح کرنا ہی نہیں چاہتے۔ اُن کے لیے اگر اس سے ہزار گنا زیادہ بھی لکھا جائے تو بھی فضول ہے۔ اب ایک نظر اس بات پر بھی ڈالنی چاہیئے کہ اہلِ حلقہ نے عالمگیر محبت اور صداقت و حق کو اختیار کرنے میں کیا کچھ کیا ہے تو جہاں تک محبّت کا سوال ہے میں کافی مطمئن ہوں لیکن اختیارِ حق کے معاملہ میں ہمارے اہلِ حلقہ کی اکثریت ابھی بہت پیچھے ہے۔ اس میں ترقی کرنے کی بڑی ضرورت ہے "طریقت توحیدیہ" میں میں نے لکھا ہے کہ جہاں محبت اور حق کا مقابلہ آن پڑے تو محبت کو قربان کر دو اور حق پر ڈٹ جاؤ خواہ اس میں کیسی ہی تکلیف اُٹھانی پڑے۔ محبّت ایک میٹھی چیز ہے اور اس کے اختیار کرنے میں مزہ ہی مزہ ہے۔ لیکن "حق" کڑوا ہوتا ہے اور اس کو اختیار کرنا مشکل ہے۔ تاہم محبّت کے مقابلہ میں اگر حق کو اختیار نہ کیا جائے تو یہ نظامِ عالم دو دن میں تباہ ہو جائے۔ اس لیے آپ کو حق پر چلنے اور قائم رہنے کی بھی سخت کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن اس میں آپ کو اس بات کا بہت خیال رکھنا چاہیئے کہ آپ حق پر ہیں بھی یا نہیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آپ ایک بات کو حق سمجھتے ہیں حالانکہ وہ حق نہیں ہوتی اور آپ غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ مثلاً آپ کا افسر یا شیخ حلقہ آپ کو حکم دیتا ہے جو آپ کو ناجائز معلوم ہوتا ہے، اس وقت آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ ایسے وقت پر آپ کو یہ سوچنا چاہیئے کہ انسان جب کسی ادارے میں داخل ہوتا ہے تو قدرتاً یا حقیقتاً وہ یہ عہد کرتا ہے کہ اُس ادارے کے تمام قوانین و قواعد پر عمل کرے گا (سوائے ان لوگوں کے جو شامل ہی جاسوسی اور بغاوت پھیلانے کے لیے ہوئے ہوں) اس طرح وہ اپنے اُوپر لازم

کر لیتا ہے کہ اپنے سربراہوں کا ہر حکم مانے گا۔ پس جب کبھی متذکرہ بالا قسم کی اُلجھن پیش آئے تو اس کو یہ خیال کرنا چاہیئے کہ اس کے لیئے حق یہ ہے کہ اپنے سربراہوں کا حکم مانے۔ یہ حکم غلط ہے یا صحیح، اس کی ذمہ داری اس پر نہیں بلکہ اُس کے سربراہوں اور حکم دینے والوں پر ہے۔ دراصل یہ فلسفۂ اخلاق کا ایک بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس چھوٹے سے خطبہ میں اس پر سیر حاصل بحث ناممکن ہے۔ اس لیے جس کسی بھائی کو شوق ہو مجھ سے زبانی گفتگو کر کے سمجھ سکتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ حلقہ کی تنظیم و تعلیم پر کافی تبصرہ ہو گیا۔ جو لوگ واقعی کچھ کرنا اور فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں اُن کو اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک بات اور بتانی ہے اور وہ یہ کہ جس کسی نے غصّہ جیسے دیو کو زیر کر لیا اس کی قوّتِ ارادی اتنی طاقتور ہو جاتی ہے کہ وہ باقی برائیوں کو بھی دُور کر سکتا ہے۔ اس لیے ہر طالبِ صادق کا فرض ہے کہ وہ خود اپنی خامیوں اور بُرائیوں پر نظر رکھے اور قوّتِ ارادی کی مدد سے ان کو دُور کرے۔ انشاء اللہ وہ منزلِ مقصود تک بخیر و خوبی پہنچ جائے گا۔

آیئے اب دُعا کریں کہ اللہ تعالےٰ اپنے حبیب حضور احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے صدقہ اور توسّل سے ہمارے حلقہ کے ہر آدمی کو صراط المستقیم پر قائم رکھے۔ دین اور دُنیا دونوں کی نعمتوں سے سرفراز کرے اور اپنا قرب و دیدار عطا فرمائے۔ ہم سے خلقِ خُدا کی خدمت و ہدایت کا کام لے اور ہمارا انجام بخیر کرے۔ آمین! یارب العٰلمین۔

بندۂ ناچیز
عبدالحکیم انصاری

لاہور
۷ اپریل ۱۹۶۷ء

اللہ تبارک تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہم سب کو پورے ایک سال بعد پھر ایک جگہ اکٹھا ہونے کی توفیق عطا فرمائی اور ایک سال تک زندہ رکھا، صحت دی اور ایک ایسے اجتماع میں شریک ہونے کے قابل کیا جس کی نظیر شاذ و نادر ہی کہیں مل سکتی ہے۔ آپ نے مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور شادی بیاہ کے کئی اجتماعات میں شرکت کی ہو گی اس لیے آپ اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں کہ جو لطف و سرور اس مبارک اجتماع میں آتا ہے اور جو سوز و ساز اور کیف و گداز یہاں ملتا ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی دنیوی محفل میں نہیں ملتا۔ ایسا پاک ماحول کہاں میسّر ہوتا ہے جہاں آنکھیں ہر طرح کی زشت و بدروئی کی طرف سے بے بصر، صرف حسن و خوبی کے جلوے دیکھتی ہیں۔ جہاں کان ہر قسم کی لغو بیانی اور بد کلامی کی طرف سے بند، صرف نغمات لاہوتی اور اصوات سرمدی سنتے ہیں۔ جہاں زبانیں ہر نوع کی بدگوئی اور غیبت و بہتان طرازی کی طرف سے گنگ، صرف حمد و ثنا کے ترانے گاتی ہیں۔ جہاں دل و دماغ ہر برے خیال اور عناد و فساد کے تمام ناپاک جذبات سے یکسر خالی، شراب عشق و محبّت کے نشہ میں چور، دیدارِ یار کی تمنّا میں دنیا و مافیہا سے بالکل غافل و سرمست

ہیں۔ الغرض! اس اجتماع میں ہر طرف خلوص ہی خلوص اور محبّت ہی محبّت ہے۔ پھر ایسے اجتماع میں شرکت کی توفیق عطا کرنے والے رحیم و کریم آقا کا شکر ہم کیوں نہ ادا کریں۔ حق تو یہ ہے کہ جتنا بھی شکر ادا کیا جائے اور جتنی بھی حمد و ثنا کی جائے کم ہے۔

خدائے قادر و قیوم کے شکر کے بعد میں اپنی اور تمام حلقۂ توحیدیہ کی طرف سے عزیزم میاں محمد علی صاحب زاد اللہ عمرہٗ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُن کی پُر خلوص محبّت اور ایثار کی وجہ سے ہمارا یہ اجتماع اس دفعہ پھر لاہور میں ہی ہو رہا ہے۔ حسبِ سابق اس مرتبہ بھی اجتماع کا سارا بار میاں محمد علی صاحب نے خود ہی اُٹھایا ہے۔ اللہ تعالےٰ اِن کو دین و دُنیا کی ہر نعمت لازوال سے مالا مال فرمائے۔ آمین۔ اجتماع کے انتظام اور اہتمام میں خصوصاً محمد قاسم صاحب اور چوہدری جلال الدین صاحب اور ان کے رفقائے کار نے اپنے مہمان بھائیوں کو آرام پہنچانے کے لیے جس خلوص و محبت سے تکلیفیں اُٹھائی ہیں میں اِن سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اللہ تعالےٰ اِن سب کو اس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین! آخر میں اِن تمام دوستوں اور مہمانوں کا بھی دِلی شکریہ ادا کرتا ہوں اور خلوص دلی کے ساتھ خوش آمدید کہتا ہوں جو دُور دراز مقامات سے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے محض اللہ اور اس کے پیارے حبیبؐ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ خدائے بُزرگ و برتر آپ سب کو اپنے اپنے مقاصد دلی میں کامیاب اور بامُراد فرمائے اور دین و دُنیا میں آپ سب کو مراتب اعلیٰ عطا فرمائے۔ اپنی اور اپنے محبوب کی محبّت کے نُور سے آپ کے قلوب کو جگمگا دے، اور ان لوگوں پر بھی جو بوجہ مجبوری شریک نہیں ہو سکے اپنے انعام و اکرام کی بارش کرے۔ آمین!

برادرانِ حلقہ! آپ جانتے ہیں کہ دُنیا میں خوشی اور غمی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہمارا حلقہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں اور میں مجبور ہوں کہ اس خوشی کے موقعہ پر کچھ غم کی خبریں بھی آپ کو سناؤں۔

پہلی خبر تو یہ ہے کہ ابھی چند دن پیشتر ہمارے ایک نہایت پرہیزگار اور مجسمۂ اخلاق و کردار عزیز ترین دوست اور گلزارِ چشت" کے سدا بہار مہکتے ہوئے پھول جناب سیّد حامی الدین صاحب ہمیں داغِ مفارقت دے کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ مرحوم نے اپنے پیچھے ایک مجموعہ اوصاف وفا شعار بیوہ اور پانچ کمسن بچّے چھوڑے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ خود ان سب کی دستگیری و سرپرستی فرمائے اور مرحوم کو اپنا قُرب عطا کرے۔ آمین۔ دُوسری اندوہناک خبر یہ ہے کہ ہمارے بنّوں کے حلقہ کے جواں سال اور باغ و بہار شخصیّت کے مالک جناب محمد نواز بھٹی نے بھی اسی سال اپنے پیچھے متعدد لواحقین کو چھوڑتے ہوئے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ تیسری خبر کراچی کے معمر بزرگ جناب قمر الدین صاحب کے وصال کی ہے۔ اور چوتھا زخم جو احباب حلقہ کے جگر گوشوں کی جُدائی کی صورت میں موت کے ظالم پنجہ نے لگایا ہے۔ اِن میں سرِفہرست جناب اصغر مرزا صاحب کے چودہ سالہ لختِ جگر اور جناب حافظ اللہ بخش و ڈاکٹر عبدالصمد غزنوی صاحب کے گلستانوں کی پہلی کلیاں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ جناب خادم حسین صاحب کے حقیقی بھائی، فلائٹ سارجنٹ رشید صاحب کے والد جناب خضر حیات صاحب کے والد، مولوی محمد یعقوب صاحب کی والدہ، عبدالحق صاحب کی بیگم، جناب عبدالستار خان صاحب کے دو چچازاد بھائی اور ایک بہن۔ محمد یونس نیٹ صاحب کا بھانجا اور جناب آفتاب احمد خان صاحب کے ماموں اور کئی بھائیوں کے قریبی رشتہ دار بھی اسی سال اللہ کو

پیارے ہوئے۔ میں اپنی اور تمام اہل حلقہ کی طرف سے اِن سب کی وفات پر اظہارِ تعزیت و ہمدردی کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ اِن سب کو جنّت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے آمین ! ثم آمین !!

آئیے اب ہم سب اِن کے لیے دُعائے مغفرت کریں۔

برادرانِ سِلسلہ ! علم تصوّف کے طالب علم عام طور پر یہ شکایت کرتے ہیں کہ اِن کو اس قدر زیادہ پڑھنے اور کرنے کو بتایا جاتا ہے جس کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔ پیٹ بھرنے کے لیے دنیوی کام کریں یا آخرت سنوارنے کے لیے اللہ اللہ! مَیں نے جب دائرہِ تصوّف میں قدم رکھا اور سلوک شروع کیا تو میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ حضرت صاحبؒ نے مجھے پانچہزار مرتبہ پاس انفاس اور اتنا ہی نفی اثبات کرنے کو بتایا۔ اِس کے علاوہ تہجّد، دُوسرے نوافل اور درود شریف کا وِرد علیحدہ تھا میں رات بھر جاگتا تھا مگر یہ اوراد پُورے نہ ہو سکتے تھے تو مجبوراً دِن میں پُورا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ دو مرتبہ امتحان میں فیل ہُوا۔ ملازمت کے دَوران میں اس سے بھی زیادہ دشواری پیش آئی۔ بہرحال سلوک طے کرنے تک مجھ کو یہ تجربہ ہو گیا کہ خدا سے تعلق زبان سے ذکر کرنے کی کثرت پر اس قدر منحصر نہیں ہے جس قدر دِل سے اس کو ہر وقت یاد رکھنے اور اخلاق کا تزکیہ کرنے پر منحصر ہے۔ چنانچہ جب میں نے سلسلۂ توحیدیہ کی بُنیاد ڈالی تو ذکر، فکر اور تزکیۂ اخلاق کے لیے مجاہدے کے تمام طریقوں میں ایسی تبدیلیاں کر دیں جو زمانۂ حاضرہ کے مزاج اور آجکل کے انگریزی تعلیم و تربیت یافتہ لوگوں کے لیے موزوں اور آسان ترین ہیں۔ اور ہر شخص جو طالبِ راہ حق ہو نہایت

آسانی سے دُنیا کے سارے کام کرتے ہوئے اِن پر عمل کر کے فائز المرام ہو سکتا ہے۔ یہ باتیں میں پہلے بھی بہت دفعہ بتا چکا ہوں لیکن آج ذرا وضاحت سے بیان کروں گا:۔

۱۔ پہلے سلسلوں میں اوراد و وظائف ہزاروں بار نہیں بلکہ لاکھوں بار پڑھنے کو بتائے جاتے تھے۔ چنانچہ بعض بزرگ سورۂ اخلاص سوا لاکھ مرتبہ بیس یا چالیس دِن میں ختم کرایا کرتے تھے۔ کم از کم ایک ہزار مرتبہ درود شریف۔ ہر نماز کے بعد اکتالیس مرتبہ الحمد شریف۔ گیارہ سو مرتبہ یا مُغنی۔ گیارہ مرتبہ سورۂ مزّمل شریف۔ اکتالیس مرتبہ سورۂ یٰسین شریف اور اس کے علاوہ بے شمار نوافل۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ جو شخص اتنا پڑھے اور پھر کھانا نہ کھائے متواتر روزے رکھے اس کی صحت کس طرح بحال رہ سکتی تھی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ نعوذ باللہ یہ باتیں فضول تھیں مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ آجکل جبکہ حصولِ معاش کے لیے دن میں کم از کم بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے، پُرانے زمانے کے اوراد و وظائف پڑھنا کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ اِس لیے میں نے صرف یہ طریقہ بتایا ہے کہ چوبیس گھنٹے میں جب بھی تم کوئی دماغی کام نہ کر رہے ہو اور خالی الذہن ہو ہر سانس سے اللہ اللہ کرتے رہو اور اللہ کی یاد سے غفلت نہ برتو۔ یہی طریقہ قرآن میں بھی بتایا گیا ہے۔ دُوسری چیز نفی اثبات کا ذکر ہے جس کے لیے میں اس بات پر زور دیتا ہوں کہ کسی حالت میں بھی پندرہ منٹ سے زیادہ نہ کیا جائے۔ اب آپ بتائیں کہ اس سے زیادہ اللہ کو یاد کرنے اور اس سے اپنی محبّت کے رشتے استوار کرنے کا اور کوئی آسان طریقہ ممکن ہے؟

۲۔ پہلے زمانے کے بزرگ اپنے مُریدوں کو نفس کُشی کے لیے بھوکا رہنا

برسوں پیدل سفر کرنا، بھیک مانگنا، ٹٹی صاف کرنا، اور محلوں میں جھاڑو دینا بتاتے تھے۔ آج کے انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کو یہ کچھ بتایا جائے تو کون ہے جو کرنے کو تیار ہوگا۔ اس کے بجائے ہم نے صرف یہ بتایا ہے کہ غصّہ اور نفرت کو نفی کر دو اور اس کی جگہ عالمگیر محبّت اور ہر کام میں حق پر عمل کو اپنے اُوپر فرض کر لو۔ اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ تعمیرِ ملّت اور طریقتِ توحیدیہ میں پڑھ لیجئے۔

۳۔ دُوسرے سلسلوں میں انکسار پیدا کرنے کے لیے یہ بتایا جاتا تھا کہ اپنے آپ کو تمام مخلوق سے ذلیل و حقیر سمجھو۔ ظاہر ہے کہ اس سے انسان کی خودی اور خودداری بالکل ختم ہو جاتی ہے اور اس کی وہ تمام اُمنگیں مر جاتی ہیں جو انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ایک معاشرے اور قوم کو زندہ، باعزت، باغیرت اور متحرک بالعمل بنانے کے لیے قدرت کی طرف سے فطرتاً پیدا کی گئی ہیں۔ ہمارے سلسلہ میں یہ تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ یہ سکھایا جاتا ہے کہ اپنی کسی چیز پر غرور نہ کرو کیونکہ اس سے آئندہ کے لیے طلب ختم ہو جاتی ہے، اور روحانیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ بلکہ ہم یہ بتاتے ہیں کہ تم نہ اپنے آپ کو ذلیل و حقیر سمجھو نہ کسی دُوسرے کو۔ ہم سب خدا کے مصنوعات ہیں۔ خدا کی کسی صنعت سے نفرت کرنا یا اُس کو ذلیل سمجھنا خود خدا کی توہین ہے۔ ہم دراصل یہ کہتے ہیں کہ تم اس قصّہ میں ہی نہ پڑو کہ کون ذلیل ہے اور کون بُزرگ و برتر ہے اور اگر تم کو ایسا کرنا ہی پڑے تو قرآن کی اس آیت کی کسوٹی پر پرکھو کہ

"جو شخص جس قدر زیادہ متقی ہے اُتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک محترم اور بُزرگ ہے۔"

۴۔ دُوسرے کئی سِلسلوں میں پیروں کی اس قدر عزّت کی جاتی ہے جو عبادت کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ مُریدوں سے نہ صرف زندہ پیروں بلکہ وفات یافتہ بزرگوں کی قبروں کو سجدے کرائے جاتے ہیں۔ اِن کو مافوق الفطرت خیال کیا جاتا ہے۔ اِن سے منّتیں مانگی جاتی ہیں اور کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔ ہم قرآن پاک اور احادیث و سنّت کی روشنی میں اس بات کو شرک اکبر جانتے ہیں۔ تعمیر ملّت میں بیسیوں آیتیں اس بات کے ثبوت میں مَیں نے تحریر کر دی ہیں جن کو ہر وقت پیش نظر رکھتے ہُوئے توحیدِ باری تعالےٰ کے عقیدے پر پورے استحکام سے ڈٹے رہیئے۔ تاہم میں آپ کو یہ ہدایت کرتا ہوں کہ جو لوگ قبر پرستی وغیرہ کرتے ہیں اُن سے اُلجھنے یا بحث کرنے کی آپ کو ہرگز اجازت نہیں ہے۔ اُن کا دین اُن کے لیے ہے اور تمہارا دین تمہارے لیے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا کہ یہ لوگ جن باتوں پر جھگڑتے ہیں۔ قیامت کے دن اُن کو معلوم ہو جائیگا کہ سچّا کون تھا۔ دُوسری بات یہ کہ جھگڑنے اور بحث کرنے سے سوائے وقت ضائع کرنے اور دلوں میں بدمزگی پیدا کرنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بحث سے کوئی شخص بھی اپنا عقیدہ نہیں بدلا کرتا۔ حتیٰ کہ کافر بھی باوجود عقلاً مان لینے کے بُت پرستی ترک نہیں کرتے۔ ہمارے سلسلہ میں پیر کی بابت صرف تین باتیں بتائی جاتی ہیں:

(۱) عقیدت (۲) اُدب (۳) فرمانبرداری۔ عقیدت کا مطلب یہ ہے کہ تُم اپنے مُرشد کو سچا خدارسیدہ اور رُشد و ہدایت کا اہل سمجھتے ہو۔ ادب، عقیدت کا ایک لازمی جزو اور انسانی شرافت کی ایک ضروری نشانی ہے۔ "با ادب بانصیب بے ادب بے نصیب" کا مقولہ غلط نہیں ہے۔ دُنیاوی محفلوں میں بھی بے اُدب انسان دُوسرے لوگوں کے دِل میں اپنے متعلق

کوئی اچھی رائے پیدا نہیں کر سکتا تو بزرگوں کی مجلس میں وہ لوگوں کے دلوں میں اپنا کوئی اچھا مقام کیسے پیدا کر سکتا ہے۔ فرمانبرداری[۳] اِس لیے ضروری ہے کہ جس راستہ پر تم چل رہے ہو تم اس سے قطعاً ناواقف ہو۔ لیکن تمہارا مُرشد جو اس راستہ کو طے کر چکا ہے اس کے تمام پیچ وخم سے خوب واقف ہے۔ اگر تم اس کے کہنے کے مطابق اندھوں کی طرح عمل نہ کرو گے تو یقیناً کسی کھڈ میں گر کر تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔ ہمارے حلقہ میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن کو خدا نے نورِ بصیرت عطا فرمایا ہے وہ دیکھ سکتے ہیں۔

۵۔ ہمارے سلسلہ میں رہبانیت اور دُنیا سے نفرت وحقارت کی تعلیم مطلق نہیں دی جاتی کیونکہ یہ قرآن پاک کی تعلیم اور حضورؐ کی سُنّت کے بالکل خلاف ہے۔ بلکہ روپیہ کمانے اور دنیوی قدر و منزلت اور عزّت و مرتبہ حاصل کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن اس طرح جس سے غرور بالکل پیدا نہیں ہو سکتا، اور یہ جو کچھ بھی کمایا اور پیدا کیا جاتا ہے وہ سب قوم، مُلک اور خلقِ خدا کی خدمت کے لیے ہوتا ہے۔

۶۔ دُوسرے سلسلوں کی معراج اور آخری منزل کشف و کرامات کا حصول ہے لیکن ہمارے سلسلے میں اِن کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے سلسلہ کا آخری مقصد اللہ کا قرب، عرفان اور لقاء کا حصول ہے۔

۷۔ ہمارے سلسلہ میں سُستی اور بیکاری سے بچنے کے لیے یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ ہر وقت کسی نہ کسی عمل میں مصروف رہو۔ اور کچھ نہ کر سکو تو تعلیم میں ترقی کرو اور ایم اے تک امتحانات پاس کرتے چلے جاؤ۔ یا کوئی ٹیکنیکل کام اور ہنر سیکھو۔ چنانچہ اس وقت ہمارے بھائیوں

میں کم از کم ڈیڑھ سو آدمی ایسے ہیں، جنہوں نے بی اے۔ ایم اے۔ اور ایل ایل بی وغیرہ کے امتحانات پاس کیے ہیں اور آج ہزاروں روپیہ مہینہ کما رہے ہیں۔

۸۔ ہمارے سلسلہ میں جماعتی تنظیم اور اجتماعی زندگی باقی سب جماعتوں سے کہیں زیادہ محکم اور مستحکم ہے۔ ہمارے ہاں وہ دقیانوسی طریقہ ختم کر دیا گیا ہے کہ ایک شیخ لاتعداد خلیفہ بنا کر اپنے حلقہ کو وسیع کر لے۔ اس طرح اُس پیر کی جماعت لاتعداد ٹکڑیوں میں بٹ جاتی ہے اور چونکہ ان خلفا کے ماحول، اخلاق، ذہنیت اور علمیت وغیرہ میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے اس لیے شیخ سلسلہ کی حقیقی تعلیم بجنسہٖ کسی ٹکڑی میں بھی باقی نہیں رہتی اور ان ٹکڑیوں کا باہمی ربط ختم ہو کر جماعت کی روح فنا ہو جاتی ہے۔

اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کوئی شخص خواہ کتنی اچھی جماعت بنائے اور وہ خواہ کتنا ہی عالم و فاضل اور خدا رسیدہ ہو ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ میری بھی صحت اب جواب دے رہی ہے معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے کل حاضر ہونا پڑ جائے یا کچھ اور برس لگ جائیں۔ اس لیے میں آپ سب کو ہدایت کرتا ہوں کہ اگر آپ کی رائے میں ہماری جماعت اور ہمارا حلقہ انسانی اصلاح کے لیے ایک مثالی حلقہ ہے اور معاشرے کی اصلاح میں کوئی خاص کردار ادا کر سکتا ہے تو آپ اب میری بجائے جماعت سے محبت کرنا اور جماعت کو زیادہ سے زیادہ عزیز رکھنا سیکھیں۔ اس کے لیے آپس میں بے انتہا محبت اور زیادہ سے زیادہ ایثار کی ضرورت ہوگی۔ اگر آپ نے ان دو باتوں پر عمل کیا تو انشاء اللہ آپ کا حلقہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے گا اور عام مسلمانوں کے اخلاق کو

سُدھارنے میں زیادہ سے زیادہ مدد دے گا۔

محبّانِ عزیز! آپ کو معلوم ہے کہ میں گزشتہ ماہ نومبر سے ہائی بلڈ پریشر اور دیگر بے شمار عوارض کی وجہ سے مُسلسل علیل چلا آ رہا ہوں۔ اور اس طویل علالت کے باعث نقاہت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ذرا سا بھی پڑھنے، لکھنے یا بولنے چالنے سے دماغ چکرانے لگتا ہے اور سانس پھُول جاتا ہے۔ لہٰذا آج کی صحبت میں مجھے آپ سے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ خلوص و محبّت کے ساتھ حلقہ کی تعلیم پر پُوری پابندی سے عمل کرتے ہُوئے پہلے کی نسبت اور زیادہ شوق اور جوش سے عمل کرو، عمل کرو اور عمل کرتے رہو۔ اپنی اور دُوسرے مُسلمانوں کی اصلاح کرو۔ دنیوی ترقی کے لیے نئی نئی راہیں نکالو اور ان پر عمل کرو۔ خلقِ خدا کی خدمت کرو۔ سب کے ساتھ محبت سے پیش آؤ۔ کتنی ہی تکلیفیں اور مصیبتیں آن پڑیں مایوس اور اُداس مت رہو، ہمت نہ ہارو، ہمیشہ خوش رہا کرو۔ دِل میں اللہ کو بسائے رکھو اور ہاتھ پاؤں، آنکھوں کانوں اور زبان کو خدمتِ خلق میں لگائے رکھو۔ یہی دائمی مسرت اور حقیقی زندگی کا راز ہے۔ مرتے دم تک کام کرتے رہو اور خدا کی یاد میں مر جاؤ۔ تمہیں کیا خبر یہ کتنا بڑا کام ہے اور مرنے کے بعد اس کا کیا انعام ملے گا۔

اب میں آپ سے صرف ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ آج تک آپ کو جو کچھ بتایا جا چکا ہے وہ سب قرآن اور احادیث رسولِ کریمؐ سے ہے۔ میری اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر آپ کا ایمانِ کامل ہے تو آپ ان باتوں کو افسانہ یا کہانی نہ سمجھیں گے بلکہ ایک ٹھوس حقیقت

جان کر ان پر عمل کریں گے۔ بشرطیکہ آپ اپنی بہبودی اور بہتری کے دل سے طالب ہوں اور دین و دُنیا کی نعمتوں سے اپنی جھولیاں بھرنا چاہتے ہوں۔ اگر آپ ان پر ایمان کامل رکھتے ہوئے بھی عمل نہ کریں تو پھر آپ سے زیادہ بدقسمت اور کون ہو سکتا ہے۔

اب آخر میں ایک نہایت ضروری بات آپ کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی بیماری کے پیشِ نظر اور حلقہ توحیدیہ کے استحکام اور بہبودی کے خیال سے ابھی سے اپنا ایک خلیفہ اور جانشین مقرر کر دیا ہے۔ صاحب موصوف جن کی تقرری کا اعلان اسی مجلس میں کیا جائے گا وہ روحانی مراتب اور اخلاقی بزرگی میں مجھ سے کسی طرح کم نہیں۔ اس لیے میں آپ سب کو ہدایت کرتا ہوں کہ اگر آپ کو میری دی ہوئی تعلیم سے محبّت ہے تو آپ سب کو میرے اس حکم کی تعمیل میں آج ہی کے جلسہ میں صاحب موصوف کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کرنا ہوگی۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آپ نہ صرف میری زندگی میں بلکہ میرے مرنے کے بعد بھی پوری خوشی اور خلوص کے ساتھ حلقہ کو مستحکم سے مستحکم تر بنانے میں صاحب موصوف کے ساتھ پورا پورا تعاون فرمائیں گے۔ جزاک اللہ۔

آیئے اب دُعا کریں کہ اللہ تعالےٰ تمام دُنیا کے مُسلمانوں پر رحم کرے، تمام ممالکِ اسلامیہ کو آپس میں اتحاد اور اتفاق عطا فرمائے اور کفّار و مشرکین کے مقابلہ کرنے کی زیادہ طاقت دے کر ان پر فتح کامل عطا فرمائے۔ ہمارے وطنِ عزیز پاکستان کو داخلی و خارجی استحکام بقاء، سلامتی، امن اور خوشحالی بخشے۔ اللہ تعالےٰ حلقۂ توحیدیہ کے تمام بھائیوں کو دین و دُنیا کی دولتوں سے مالامال کرے۔ اپنی

راہ پر مزید خلوص اور جوش سے چلنے کی توفیق دے۔ اپنی اور اپنے محبوبؐ کی محبت کے نور سے ہمارے قلوب کو جگمگا دے۔ ہمیشہ صراط المستقیم پر قائم رکھے اور اپنے پیارے رسولؐ کے صدقے میں یہ ہمّت دے کہ ہم اپنی جان، اپنی روح، اپنے جسم کا ایک ایک ذرّہ۔ اپنی ملکیّت کا ایک ایک پیسہ اور اپنے خون کا ایک ایک قطرہ اُمّت محمدؐیہ کی خدمت اور فلاح و بہبود کے لیے نچھاور کر دیں۔ آمین یا رب العلمین۔

بندہ ناچیز
خادم الخدام حلقہ توحیدیہ
عبدالحکیم انصاری

لاہور
۱۳ را پریل ۱۹۶۸ء

یہ حکمت ملکوتی یہ علم لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

○

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

○

یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریک شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(اقبالؒ)